

استعمار کا نیا بھیس

تعصب، منافقت اور دو رُخ پن کا نقاب اوڑھے اور نشہ طاقت میں سرشار دنیا کے چار ممالک (امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی) مسلم دنیا پر اس وقت حکمرانی کر رہے ہیں لیکن دنیا نہ تو ان کے عزائم اور منصوبہ بندی کو سمجھتی ہے اور نہ ہی کہیں ان کی سڑتھٹی کے تحقیقی مطالعہ کا انتظام نظر آتا ہے۔ اکثر لوگوں کو اس نئے استعماری گروہ، جو درحقیقت پرانے استعمار ہی کا تسلسل ہے، کے کرتوتوں کے نتائج و عواقب کا، جس کا مرکز واشنگٹن ہے، ابھی تک صحیح اندازہ نہیں ہے۔

بظاہر یہ چاروں ممالک ہر معاملے میں متحد نظر نہیں آتے اور نہ ان کی خارجہ پالیسی ہی ایک لگتی ہے لیکن جب مسلم دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آتا ہے تو یہ متحد ہو کر سازش کرتے ہیں، باہم تعاون کرتے ہیں اور مل کر حملہ کرتے ہیں۔ عراق پر حملہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے جس کا کوئی اخلاقی اور قانونی جواز نہیں تھا۔ حال ہی میں منحرف عراقی سائنس دان رافد علوان الجنبانی نے، جسے امریکی اور جرمن خفیہ ایجنسیوں نے Curve Ball کا کوڈ نام دیا تھا، اور جس نے عراق جنگ سے پہلے یہ بیان دیا تھا کہ عراق میں مہلک کیمیائی ہتھیار موجود ہیں، تسلیم کیا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن ظاہر ہے امریکی اور جرمن اتنے بھولے نہیں تھے کہ انہیں اصل معاملے کی خبر نہ تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے الجنبانی کو استعمال کیا جس طرح کہ الجنبانی نے ڈالروں اور سیاسی پناہ کے لیے انہیں استعمال کیا اور تباہی و بربادی عراقیوں کے حصے میں آئی۔

چار ممالک کے اس نئے استعماری ٹولے اور پرانے استعمار میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں بشرطیکہ کوئی ان کے بظاہر خوشنما الفاظ اور نعروں کے پیچھے جھانک کر دیکھ سکے خصوصاً یہ بات کہ وہ مسلمانوں، ان کے دین، تہذیب اور ان کے فکر و عمل سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ وہ مافیا ہے جو اپنے مفاد کے لیے ہر وقت جمہوریت کے نعرے لگانے کے باوجود دہائیوں سے عالم اسلام میں درجنوں آمر پال رہا ہے اور جب بدلتے ہوئے حالات میں اسے نئے مہرے کی ضرورت ہوتی ہے تو راتوں رات ان آمروں کے خلاف ہو جاتا ہے جیسے مصر میں اس کا حلیف حسنی مبارک کل تک بہت بڑا سیاسی مدبر تھا اور نہایت دانشمندی سے مصر کا نظام حکومت چلا رہا تھا لیکن اگلے دن ’جمہوریت‘ کا تقاضا یہ تھا

کہ اسے صدارت چھوڑ دینی چاہیے تاکہ تازہ دم مہرہ اس کی جگہ لے سکے۔
 نئے استعماری ٹولے کی بنیادی پالیسی وہی ہے جسے اس سے پہلے استعماری عہد میں برطانیہ،
 فرانس اور جرمنی نے استعمال کر کے مسلم دنیا کے بڑے حصے پر آرام سے حکومت کی تھی اور وہ یہ کہ
 دولت سے میر جعفریوں اور میر صادقوں کو خرید لو اور (بنگال کے) سراج الدولہ اور (میسور کے) ٹیپو
 سلطان جیسے مخالفوں کو کچل دو۔ ان جیسے غداروں کی وجہ سے ہی برصغیر کو کئی برسوں تک غلامی کا طوق
 پہننا پڑا تھا۔ ایسے میر صادقوں اور میر جعفریوں کی آج بھی کمی نہیں جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے قوم و ملک
 کو بیچنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

اس نئے استعماری چار کے ٹولے کی کامیابی کا انحصار آج بھی اسی پرانی پالیسی پر ہے اور جہاں بھی
 اسے ضرورت ہوتی ہے وہ میر جعفریوں اور میر صادقوں کو اپنی دولت سے خرید لیتا ہے جو اسے بسہولت
 اور بکثرت مل جاتے ہیں۔ اسی بناء پر اسے سارے عالم میں یمن سے لے کر مراکش تک، ایسے پالتو
 حکمران ملے ہوئے ہیں جو اس کے اشارہ ابرو پر دم ہلاتے رہتے ہیں۔ اسے سابقہ استعماری دور کا
 تسلسل ہی کہا جاسکتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ اس نئے استعماری چار کے ٹولے کو مسلم ممالک کی فوج
 سے بھی اب ایسے جرنیل اس قسم کی پالتو حکمرانی کے لیے مل جاتے ہیں۔

انیسویں صدی کے برعکس نئے استعماری ممالک اب براہ راست حکمرانی پر اصرار نہیں کرتے
 کیونکہ انہیں مسلم ممالک میں اب ایسے سیاسی گروپ اور وار لارڈز (اور فوجی جنرل) آسانی سے مل
 جاتے ہیں جو بعض اوقات ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں لیکن مغربی آقاؤں کے مفادات کی
 غلامی کے لیے ہر وقت تیار ملتے ہیں۔ جیسے انہیں پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کے بعد زرداری مل
 گیا اور مصر میں حسنی مبارک کے بعد سلیمان مل گیا۔

تاہم قدرت کا ایک اپنا نظام ہے جس کی رو سے تاریخ کے میدان میں نئے عوامل ابھرتے رہتے
 ہیں چنانچہ آج کل مسلم ممالک میں ایک نیا فیکٹر ابھر رہا ہے جس کی وجہ سے اہل مغرب کے لیے اپنے
 پالتو مسلم حکمرانوں کے ذریعے مفادات کا حصول مشکل تر ہوتا جا رہا ہے کیونکہ مسلمان عوام نے ان کے
 کھیل کو سمجھنا شروع کر دیا ہے کہ ان کے ساتھ ہاتھ کون کر رہا ہے اور کیسے کر رہا ہے؟ اس وجہ سے
 گماشتہ حکمرانوں کا عرصہ اقتدار تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ مسلم عوام میں یہ
 بیداری کیسے پیدا ہو رہی ہے، کیونکہ یہی بیداری ایک دن نئے استعماری ڈھانچے کو راکھ کا ڈھیر بنا

دے گی، ان شاء اللہ۔

مسلم دنیا میں جو تبدیلی راہ پارہی ہے اس کا محرک مسلم دنیا کے دانشوروں کا ایک مختصر سا گروپ ہے جو عوام کو یہ بتا رہا ہے کہ ان کے ساتھ ہو کیا رہا ہے بعض ممالک میں اس حوالے سے عدلیہ کا بھی ایک کردار ہے لیکن یہ بات ابھی ہر ملک پر صادق نہیں آتی۔ اس تبدیلی کا محرک نوجوان دانشوروں کا وہ گروہ ہے جس نے مغربی جارحیت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اس میں کچھ دلیر اور دیانت دار صحافی بھی شامل ہیں جنہوں نے الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے عوام کو حقائق سے آگاہ کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس سے استفادے کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں اور یہی امر اس سے پہلے مسلمان عوام کی بیداری میں ایک اہم رکاوٹ رہا ہے۔ ان نوجوان صحافیوں اور دانشوروں کی کوئی سیاسی بنیاد نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنے معاشرے کے حالات کا تجزیہ کر کے خود یہ کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ نئے استعماری چار کے ٹولے کے لیے مسلم امہ کو غلام رکھنے کے منصوبے میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔

گماشتہ مسلم حکمرانوں کے اپنے ہی عوام کے خلاف اقدامات اور ان حکمرانوں کے خلاف نوجوان صحافیوں اور دانشوروں کی اس مزاحمت نے مسلم معاشرے میں کشمکش اور فساد کو جنم دیا ہے جس کی وجہ سے وہاں زندگی پُر امن اور پُر سکون نہیں رہی۔ مغرب کے یہ پالتو حکمران ہر وہ قدم اٹھانے کو تیار ہو جاتے ہیں جس کا حکم ان کے آقا انہیں دیں خواہ وہ کتنا ہی کریہہ اور عوام دشمن کیوں نہ ہو۔ اور مصیبت یہ کہ ان کی اکثریت اتنی کرپٹ ہے کہ وہ اپنے بل بوتے پر حکمران رہ ہی نہیں سکتی جب تک اس نئے استعماری چار کے ٹولے کی حمایت انہیں میسر نہ ہو چنانچہ وہ ہر معاملے میں امریکہ اور اس کے حلیفوں کے مفادات کا خیال رکھتے ہیں۔ نئے استعماری چار کے ٹولے اور ان کے ساتھ پالتو مسلم حکمرانوں کا یہ گٹھ جوڑ سارے عالم اسلام میں بہت واضح ہے اور حال ہی میں مصر میں جو کچھ ہوا، اس کے بعد اس کے لیے کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی جہاں نئے حسی مبارک نے پُرانے حسی مبارک کی جگہ لے لی ہے اور اب دجل و فریب کے نئے بھیس میں وہ اس چار کے نئے استعماری ٹولے کے مفادات کے تحفظ کے لیے کام کرتا رہے گا اور مصر کے مسلم عوام اپنی خواہشات کی چتا میں جلتے رہیں گے۔ (شکریہ دی نیوز)

پاکستانی معاشرے کا بحران اور اس کا حل (۲)

اس وقت تک ہم نے جو کچھ عرض کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی دینی قوتیں اسلامی احکام پر عمل اور ریاستی قوت سے ان کے نفاذ کے لیے جو کوششیں کر رہی ہیں ان کو مزید مؤثر بنانے کی ضرورت ہے (اور اس کے لیے ٹھوس تجاویز ہم نے دی ہیں) مزید یہ کہ ریاستی قوت کے بغیر بھی سماجی سطح پر اس طرح منظم ہو کر، جس کی اجازت ملک کا آئین و قانون دیتا ہے، دینی احکام پر عمل کے حوالے سے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے جو اس وقت کوئی نہیں کر رہا — لیکن ہونا چاہیے۔ زندگی کے کچھ شعبوں کے بارے میں ہم اس کا تذکرہ برسبیل مثال کریں گے کہ وہاں کیا کیا جاسکتا ہے۔

بطور تذکرہ و تلیخیص ہم دوبارہ یہ بھی عرض کر دیں کہ ہم جن کاموں کے کرنے کی تجویز دے رہے ہیں ان کی نوعیت کیا ہے؟ ہم نے غیر سیاسی سطح پر اجتماعی قوت سے عصری حالات و مسائل کے تناظر میں اسلامی احکام اور ان کے تقاضوں پر عمل کرنا ہے اور غیر اسلام کو رد کرنا ہے (وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ۔۔۔ [آل عمران ۵۸:۳]) خصوصاً مغربی فکر و تہذیب کو جو اس وقت غیر اسلام کی سب سے بڑی مظہر اور بطور نظام حیات اسلام کی متبادل اور مد مقابل ہے اور چونکہ طاقت ور اور غالب ہے اور اس کی علمبردار عالمی طاقتیں مسلم معاشرے میں اس کے نفوذ و نفاذ کے لیے ترغیب و ترہیب کا ہر سامان کر رہی ہیں اور مسلمان اپنی کج فہمی اور کم فہمی سے اس کی طرف لپکے جا رہے ہیں لہذا مغربی تہذیب کا رد ناگزیر شرعی تقاضا ہے ☆۔ اب ہم مختلف شعبہ ہائے حیات میں مطلوب کاموں کی طرف آتے ہیں۔

تعلیم و تربیت

۱۔ ہمارے ہاں تعلیم میں موجودہ شہویت یا دوئی (یعنی یہ کہ معاشرے میں مروج دینی تعلیم میں دنیوی علوم کا گزر نہیں اور جدید تعلیم سیکولر بنیادوں پر منظم ہے اور اس میں مطلوب حد تک مذہبی تعلیم اور دینی تقاضوں کا اہتمام نہیں) غیر اسلامی ہے۔ اسے ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ:

☆ مغربی تہذیب کی کلی یا جزوی قبولیت پر جتنے دلائل دیے جاسکتے ہیں ہم انہیں اپنی کتابوں میں بدلائل رد کر چکے ہیں مثلاً دیکھیے اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش اور مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل۔ یہاں اگر ہم نے ان دلائل کا اعادہ کیا تو موضوع سے ہٹ جانے کا خدشہ ہے۔

i۔ جدید تعلیمی ادارے اپنے نصاب پر نظر ثانی کریں۔ دینی تعلیم کا ایک جامع نصاب اپنے ہاں رائج کریں اور دنیوی علوم (خصوصاً عمرانی علوم یعنی Social Sciences) کا نصاب ایسا ہو جو متعلقہ شعبے میں اسلامی رہنمائی کی موجودگی کو یقینی بنائے۔ نیز تعلیم میں مغربی فکر و تہذیب کے غلبے کی راہ ہموار کرنے والے عوامل کو لازماً ترک کر دیا جائے۔ ان عوامل میں سے کچھ اہم یہ ہیں: ۱۔ انگریزی ذریعہ تعلیم ۲۔ غیر مسلم اور غیر پاکستانی مصنفین کی مرتب کردہ نصابی کتب جیسے آکسفورڈ کی کتابیں ۳۔ غیر ملکی اداروں کے امتحانات جیسے او اور اے لیول کے امتحانات ۴۔ طلبہ اور اساتذہ کا مغربی لباس اور یونیفارم پہننا ۵۔ مخلوط تعلیم ۶۔ مغربی لائف سٹائل سے ہم آہنگ غیر نصابی سرگرمیاں جیسے مخلوط مینا بازار، پکنک، لغو ڈرامے، کنسرٹ۔۔۔ وغیرہ۔

تعلیمی انتظامیہ اور اساتذہ کی ایسی تربیت کا انتظام ہو کہ وہ خود دینی تعلیمات پر عمل کریں اور طلبہ کو عملی اور اچھا مسلمان بنانے کا ہنر سیکھیں تاکہ وہ ان کی سیرت و کردار کی تعمیر کا کام کر سکیں۔

ii۔ دینی تعلیم اس طرح دی جائے کہ وہ اپنے فضلاء کو عصر حاضر کے مسائل میں رہنمائی فراہم کرنے کے قابل بنائے اور وہ عصری اسلوب اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہو مثلاً اسلامی فقہ یا قانون کی تعلیم دینی ہو تو اسلامی اصول و فقہ کے ساتھ مغربی قوانین اور اصولوں کا تقابلی مطالعہ بھی کیا جائے اور پاکستانی آئین و قوانین اور اہم عالمی قوانین (مثلاً اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر وغیرہ) بھی زیر مطالعہ آئیں اور عصر حاضر کے اجتہادی مسائل پر بھی گفتگو ہو، یا مثلاً اسلام کی معاشی تعلیمات پڑھائی جائیں اور اس طرح پڑھائی جائیں کہ مغرب کا معاشی فلسفہ و ڈھانچہ اور پاکستانی معیشت کے مسائل بھی اس کا حصہ ہوں تاکہ علماء کرام عصر حاضر کے معاشی مسائل کا حل اسلامی تناظر میں بتا سکیں، یا مثلاً عربی صرف و نحو پڑھانی ہو تو جدید اسلوب میں پڑھائی جائے، قواعد رٹنے کا پرانا طریقہ ختم کر دیا جائے اور زبان اس طرح سکھائی جائے کہ اسے سننے، سمجھنے، بولنے اور لکھنے کی مہارتیں طلبہ کو حاصل ہو جائیں۔

ان باتوں پر عمل کیسے ممکن ہے؟

i۔ پرائیویٹ سیکٹر میں سکول، کالج، یونیورسٹیاں اور دینی مدارس چلانے والے اصحاب ان تجاویز پر

عمل کریں اور وہ ایسا کر سکتے ہیں اور اس میں کوئی امر مانع نہیں اور بظاہر جو امور آڑے آسکتے ہیں ان کا حل موجود ہے صرف نیت اور عزم صادق ہونا چاہیے ☆۔

ii۔ ان صفات کے حامل نئے سکول، کالج، یونیورسٹیاں، دینی مدارس اور اسلامک سنٹرز پرائیویٹ سیکٹر میں بنائے جاسکتے ہیں۔ بنگلہ سیکٹر میں اسلامی ذہن کے لوگ اگر مل بیٹھ کر سوچیں تو غیر سودی بنیادوں پر ایک ایجوکیشن بنک قائم کیا جاسکتا ہے جو ملک بھر میں اس طرح کے تعلیمی ادارے قائم کرنے میں مدد کرے یا اس مقصد کے لیے ایک ملک گیر تعلیمی فاؤنڈیشن یا ٹرسٹ بنایا جاسکتا ہے جس میں لوگ فروغ تعلیم کے لیے اپنے عطیات اور زکوٰۃ و صدقات جمع کروائیں (اس کی تفصیل آگے آرہی ہے)۔

iii۔ ان کاموں کو منظم کرنے کے لیے تنظیمیں اور ادارے بنائے جاسکتے ہیں مثلاً ایسا ادارہ بنایا جاسکتا ہے جو مطلوبہ نصابات اور نصابی کتب تیار کرے اور ایسا ادارہ بھی بنایا جاسکتا ہے جو مطلوبہ صفات کے حامل اساتذہ تیار کرے۔ اسی طرح سے ایسی تعلیمی فاؤنڈیشن یا ٹرسٹ بھی بنائے جاسکتے ہیں جو موجودہ تعلیمی اداروں کو مجوزہ تعلیمی اصلاحات کی طرف راغب کریں، اور مذکورہ اصلاحی کوششوں کو منظم کریں۔ ان کاموں کی اہمیت میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ ضرورت صرف احساس کرنے اور منظم کام کرنے کی ہے۔

ترہیت

۱۔ تعلیم کی اصل غایت ترہیت ہے جسے قرآن حکیم تزکیۂ نفس کہتا ہے اور عام فہم انداز میں اسے تعمیر سیرت و کردار کہا جاتا ہے یعنی نفس انسانی کی ایسی ترہیت کہ وہ اللہ کا عبد بن کر زندگی گزارنے لگے۔ یہی ایک مسلمان کی معراج ہے اور یہی وہ منزل ہے جس پر پہنچنے کے لیے سارے نظام تعلیم (تعلیمی ادارے کی انتظامیہ، اساتذہ، طلبہ اور والدین) کو جدوجہد کرنی چاہیے۔ اس منزل تک پہنچنے کے وسائل ہیں موزوں نصاب، اساتذہ کی صحیح ترہیت، تعلیمی ادارے کا مناسب ماحول اور اس مقصد سے ہم آہنگ ہم نصابی سرگرمیاں۔

☆ ہم نے اس موضوع پر بے شمار مضامین لکھے ہیں، بروشرز شائع کیے ہیں اور کتب مدون کی ہیں مثلاً ۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل ۲۔ ہمارا دینی نظام تعلیم ۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی ۴۔ مطالعہ قرآن و سنت برائے جماعت اول تا پنجم۔۔۔ وغیرہ اور اب بھی اس موضوع پر ہر اعتراض اور ہر سوال کا مدلل جواب دینے کے لیے تیار ہیں۔

۲۔ بڑوں کی تربیت بھی ہمارے نزدیک تعلیم ہی کی ایک توسیعی شکل ہے اور جس طرح شرح تعلیم کی بہتری اور معاشرتی ترقی کے لیے آج کل کی حکومتیں بچوں کی تعلیم کے ساتھ تعلیم بالغاں کا شعبہ بھی قائم کرتی ہیں اسی طرح مسلم معاشرے میں بالغوں اور بڑوں (grown ups) کی تربیت کا اہتمام بھی مسلم معاشرہ کرتا رہا ہے اور اب بھی اس کی شدید ضرورت ہے۔ اور یہ شعبہ بھی مسلم سوسائٹی کے دیگر شعبوں کی طرح چونکہ زوال کا شکار ہو چکا ہے اور وراثتی نظام، جہالت اور غیر اسلامی رسوم و رواج نے اسے برباد کر دیا ہے اس لیے اس کی تنظیم نو کی ضرورت ہے۔ بہر حال ایسی تربیت گاہیں قائم کرنی چاہئیں جہاں لوگ اپنی روٹین کی مصروفیات ترک کر کے کچھ دن قیام کریں اور تہذیب نفس اور دین پر عمل کا ریفریشر کورس کریں۔ ایسی تربیت گاہیں، تعلیمی اداروں خصوصاً یونیورسٹیوں کا حصہ بھی ہو سکتی ہیں۔ ان تربیت گاہوں کا لائحہ عمل اور طریق کار کیا ہوگا؟ اس مرحلے پر چونکہ تفصیلات دینا ہمارے پیش نظر نہیں لہذا ہم صرف ان کاموں کی نشاندہی پر اکتفا کریں گے جو معاشرتی سطح پر، حکومتی مدد کے بغیر، منظم کیے جاسکتے ہیں۔

میڈیا

غیر رسمی تعلیم کا ایک بڑا مظہر میڈیا ہے جس میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا شامل ہے۔ تاہم پرنٹ میڈیا پر بھی آج کل الیکٹرانک میڈیا چھا گیا ہے کیونکہ الیکٹرانک میڈیا سے استفادے کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں۔ پرنٹ میڈیا کی طرح الیکٹرانک میڈیا بھی آج کل پرائیویٹ ہاتھوں میں ہے لہذا جس سوشل چینج کی ہم بات کر رہے ہیں اس کے لیے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں کام کو آسانی سے منظم کیا جاسکتا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے اس لیے کہ میڈیا آج کل بہت مؤثر ہے اور ہمارے عہد میں ذہن سازی اور فکر و عمل کی تشکیل میں انتہائی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ میڈیا کا یہ کردار بدقسمتی سے مغربی فکر و تہذیب کی اندھی پیروی کی وجہ سے زیادہ تر تحریبی رخ اختیار کر چکا ہے۔ یہ فکری انتشار پھیلا رہا ہے، اخلاقی اقدار تباہ کر رہا ہے اور مسلم معاشرے کو اسلامی اصول و اقدار سے ہٹا رہا ہے۔ جب کہ ہماری یہ حالت ہے کہ ہم اپنے ملی آدرشوں کے حوالے سے بے حیثی کی حد تک بے حس ہیں اور مغرب چونکہ اپنے مقاصد کے لیے فعال، متحرک اور منظم ہے اس لیے خود ہمارے میڈیا ہی کے اندر سے یہ باتیں (یا افواہیں) باہر آرہی ہیں کہ اکثر بڑے چینلز، اینکر پرسنز اور اخبارات کو امریکہ نے خرید رکھا ہے اور وہاں سے سادہ لوح مسلم عوام کو وہی دکھایا اور پڑھایا جا رہا

ہے جو مغربی فکر و تہذیب کے علمبردار مغربی ممالک چاہتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون دوسری طرف ہماری سادہ لوحی اور کور ذوقی بلکہ حماقتوں کا یہ حال ہے کہ جن لوگوں نے مذہبی چینلز کھول رکھے ہیں ان کے پیش نظر سستی قسم کی فرقہ واریت پھیلانے کے سوا کوئی بڑا مقصد نہیں۔ لہذا اس امر کی فوری ضرورت ہے کہ:

۱۔ اسلامی اور معاشرتی تبدیلی کے خواہاں عناصر ایسے چینلز (یا ابتداءً کم از کم ایک چینل ایسا) قائم کریں جہاں سے مسلم فرد کی ذہن سازی صحیح خطوط پر ہو یعنی وہ نہ صرف فحاشی و عریانی اور فرقہ واریت سے پاک ہو بلکہ اسے مغرب کی ملحدانہ فکر کے رد کا ادراک ہو اور جو اسلامی تعلیمات کو عامۃ الناس اور پڑھے لکھے عناصر دونوں کی سطح پر فنی اور علمی لحاظ سے مؤثر اور دلچسپ انداز میں پیش کر سکے۔ جب تک ایسا ٹی وی چینل قائم نہ ہو کم از کم پرائیویٹ پروڈکشن ہاؤسز کے ذریعے ایسے پروگرام ضرور تیار اور آن ایئر کرائے جائیں اور معاشرے میں پھیلانے جائیں اور اس کے لیے ابلاغ کی ساری ممکنہ صورتیں استعمال کی جائیں جیسے انٹرنیٹ، سی ڈی، ڈی وی ڈی، کیبل چینلز۔۔۔ وغیرہ اور اس کے لیے حسب ضرورت باقاعدہ تنظیمی میٹ ورک قائم کیا جائے۔

۲۔ دینی اہداف رکھنے والے لوگ فرقہ واریت اور پارٹی سطح سے اوپر اٹھ کر اسلامی کاز کے لیے کام کرنے کا سوچیں اور ایسے افراد کے گروپ تیار کریں جو منظم انداز سے اخبارات میں لکھیں اور حالات حاضرہ اور معاشرے میں ابھرنے والے نوبہ نو مسائل میں اسلامی حوالے سے صحیح نقطہ نظر پیش کریں۔ اردو اخبارات میں بھی اس کی ضرورت ہے لیکن انگریزی پریس میں تو اسلامی تناظر میں صحیح نقطہ نظر سے لکھنے والوں کی شدید کمی بلکہ قحط الرجال ہے۔

۳۔ ایسا میڈیا کالج یا انسٹی ٹیوٹ قائم کرنا چاہیے جہاں ایسے پروفیشنلز تیار کیے جائیں جو فنی مہارت رکھنے کے ساتھ دینی جذبہ بھی رکھتے ہوں تاکہ جب وہ پروفیشن میں جائیں تو دینی اقتدار کی پاسداری اور ترویج کریں۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں ورکنگ جرنلسٹوں، میڈیا پروفیشنلز اور علماء کرام کی تربیت بھی کی جاسکتی ہے۔

معیشیت

۱۔ محلے کی سطح پر ایسی کمیٹی بنائی جائے (چونکہ ہمارے ہاں ہر محلے میں مسجد ہوتی ہے اور نمازی بھی ہوتے ہیں) [والحمد للہ علی ذلک] لہذا نمازی حضرات مل کر ایسی کمیٹی آسانی سے بنا سکتے ہیں)

جو اپنے محلے کے غریبوں، محتاجوں اور بیواؤں کی فہرست بنائے اور محلے کے کھاتے پیتے لوگوں سے فنڈ جمع کر کے ان کی مستقل مدد کرے۔ اگر رقم زیادہ نہ ہو (مثلاً ایک سو روپے ماہانہ) تو متوسط طبقے کے اکثر گھرانے بھی اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ بظاہر یہ کام معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن اگر یہ بتدریج پورے ملک میں منظم ہو جائے تو ایک ایسا سوشل سیکورٹی سسٹم پروان چڑھ سکتا ہے جس کی وجہ سے کسی محلے میں کوئی غریب بھوکا نہ سوئے اور کوئی بھوک سے خودکشی نہ کرے۔

۲۔ ملک میں جمع زکوٰۃ و صدقات کے لیے ایک ملک گیر 'زکوٰۃ فاؤنڈیشن' قائم کی جائے جس کو چلانے والے معاشرے کے ایسے نیک نام افراد ہوں جن کی بے لوثی، بے غرضی اور دیانت مسلمہ ہو تاکہ لوگ اس اعتماد سے اپنے زکوٰۃ و صدقات اس میں جمع کروائیں کہ ان کا صحیح استعمال ہوگا۔ اس فاؤنڈیشن کا نیٹ ورک اتنا منظم ہو اور ہر شہر اور قصبے تک وسیع ہوتا کہ ہر جگہ سے بحفاظت اس میں پیسے جمع ہوں اور تدبیر، تنظیم اور منصوبہ بندی سے شفاف طریقے سے خرچ ہوں اور خرچ کی مدات واضح اور متعین ہوں جیسے بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی، تعلیم، صحت وغیرہ۔ مذکورہ بالا محلہ کمیٹیاں اس کی تنظیم میں ہاتھ بٹا سکتی ہیں۔

۳۔ زکوٰۃ فاؤنڈیشن کی طرز پر 'جمع فاؤنڈیشن' بھی بنائی جاسکتی ہے جس میں لوگ حج اور عمرے کے لیے پیسے جمع کرواتے رہیں۔ یہ فاؤنڈیشن حج سے متعلق دیگر امور بھی منظم کرے۔ خصوصاً اسے دینی و اخلاقی لحاظ سے فرد کے لیے مؤثر، مفید اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے بھی کام کرے۔ اسی طرح 'قربانی فاؤنڈیشن' بھی قائم کی جاسکتی ہے تاکہ عام لوگ ہر ماہ ایک متعین رقم جمع کراتے رہیں اور پھر عید کے موقع پر انہیں سہولت قربانی کا جانور میسر آ سکے اور ساتھ ہی انہیں قربانی کا مفہوم اور شرعی غایت بھی بتائی جاسکے۔

۴۔ 'اسلامی بنگلنگ' کے نام پر ہمارے ہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ غلط اور ناقابل قبول ہے اور علماء کی اکثریت اسے رد کر چکی ہے کیونکہ مغرب کے بلکہ یہودیوں کے قائم کردہ بنگلنگ کے نظام میں چند سرسری اور برائے نام اسلامی تبدیلیاں کر دینے سے یہ نظام اسلامی نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا مجموعی مزاج اور طریق کار علیٰ حالہ باقی رہتا ہے اور اس پر اسلامی کا ٹھپہ لگ جاتا ہے (جیسا کہ ہم نے جمہوریت کے بارے میں کہا ہے کہ مغرب کی لادینی جمہوریت میں چند لفظی تبدیلیوں کے بعد اسے 'اسلامی' ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا ہے لیکن عملی صورت حال یہ ہے کہ اس مزعومہ اور برائے نام 'اسلامی

جمہوریت سے نہ ملک میں اسلام آیا ہے اور نہ دینی عناصر کو اقتدار ملا ہے (اور نہ آئندہ اس کا امکان نظر آ رہا ہے، بلکہ الٹا مغربی فکر و تہذیب اور اس کی لادینیت پر مبنی اقتدار پورے معاشرے میں غالب آچکی ہیں اور اسلام صرف مسجدوں اور مدرسوں میں رہ گیا ہے اور نیکی کے یہ بجزیرے بھی خطرے کی زد میں ہیں اور خدا نخواستہ کسی وقت بھی مغربیت کے سیلاب میں بہہ جائیں گے)۔ اسی طرح موجودہ برائے نام اسلامی بینکنگ، یہودیوں کے سرمایہ دارانہ نظام کا کل پرزہ (Tool) بن کر رہ گئی ہے اور اس سے اسلام کے معاشی نظام کا احیاء ممکن نہیں ہے۔

جس چیز کی ضرورت ہے اور جو بالکل ممکن اور قابل عمل ہے وہ یہ ہے کہ علماء کرام اور سکالرز اسلامی ذہن کے بنکرز کے ساتھ مل کر بیٹھیں اور ایسے اداروں کی بنیاد رکھیں جو سچے سچ اسلامی بینکنگ ہو بلکہ اس کا نام بھی 'بنک' نہ ہو تو بہتر ہے۔ لیکن یہ ادارہ صحیح اسلامی معاشی اصولوں پر کام کرے اور لوگوں کی آج کی ضروریات بھی پوری کرے۔ یہ اگر کل ممکن تھا (اور ہم نے دنیا کو ایک ہزار سال تک ریاست کا معاشی نظام بلا سود بنیادوں پر چلا کر دکھایا) تو یہ آج بھی ممکن ہے کہ اللہ کا دین ہر عہد کے لیے ہے اور ایسے سرمایہ دار بھی موجود ہیں جو اس طرح کے نظام پر عمل کریں لہذا ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہمارے علماء اور سکالرز یہ عہد کر کے بیٹھیں کہ ہم نے یہودیوں کے نظام سرمایہ داری کے 'سودی بینکنگ' نظام کی پیروی نہیں کرنی بلکہ نئی بنیادوں پر ایک نیا ادارہ بنانا ہے اور یہ بنیادیں اسلامی ہوں گی تو ایسا ادارہ بن جائے گا اور ان شاء اللہ چل جائے گا۔ اصل چیز یہ ہے کہ مغرب کی ذہنی غلامی سے نکلا جائے، اس کے نظام کو رد کر دیا جائے اور اس کے نظام کے ساتھ مفاہمت (Reconciliation) اور ایڈجسٹمنٹ کی پالیسی اختیار نہ کی جائے بلکہ اپنی فکر کے مطابق اپنے نئے ادارے بنائے جائیں اور یہ بالکل ممکن ہے۔

اخلاق و معاشرت

محکمے کی سطح پر بننے والی مذکورہ کمیٹیاں اخلاقی اصلاح اور مقامی معاشرتی مسائل کے حل میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں اور زندگی کو خوشگوار، مشقت سے پاک اور مطابق شریعت بنانے میں ٹھوس کردار ادا کر سکتی ہیں مثلاً:

- گلیوں میں روشنی کا انتظام

- گلیوں میں پانی کھڑا نہ ہو، گٹر بند نہ ہوں

- موزوں سکولوں، کالجوں میں داخلے کے سلسلے میں مشاورت اور مدد
- محلے میں اگر گورنمنٹ یا پرائیویٹ سکول یا دینی مدرسہ ہو تو اس سے رابطہ اور اسے تعلیمی اور اخلاقی لحاظ سے مؤثر اور کامیاب بنانا۔
- افراد محلہ کی غم و خوشی کی تقریبات میں باہم شرکت و تعاون سے ہمسایوں کے حقوق کی ادائی اور معاشرتی اخوت و بھائی چارے کا فروغ
- گلیوں کی کنڑوں اور پارکوں میں نوجوانوں کے جمع ہونے پر اور ان کی غیر تعمیری سرگرمیوں پر نظر رکھنا

- محلے میں اگر نیٹ کیفے، وڈیو شاپ یا ریستورانٹ ہوں تو ان پر نظر رکھنا کہ وہ مفسد اخلاق سرگرمیوں کے مرکز نہ بنیں

- بچوں اور نوجوانوں کے لیے تعمیری سرگرمیوں کا فروغ مثلاً کھیلوں کو منظم کرنا، لائبریریاں اور سنڈی سرکل قائم کرنا، انہیں تعمیری اور اسلامی فلمیں دکھانا، ترجمہ قرآن کے حلقے قائم کرنا، بچوں کے قرآن پڑھنے کا انتظام کرنا، خواتین اور بچیوں کے لیے دینی سرگرمیاں منظم کرنا (کیونکہ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں ان کے مسجدوں سے استفادے کا رجحان موجود نہیں)، بے نمازیوں کو مسجد میں نماز پڑھنے کی ترغیب دینا، ایک دوسرے کے گھروں میں افطاریاں رکھ کر باہم تعلقات کو فروغ دینا، تقریبات مثلاً عقیقہ، منگنی، شادی، عیدین اور قربانی وغیرہ کے مواقع پر اہل محلہ کو کھانا، گوشت یا مٹھائی بھجوانا (شہروں میں اس کا رواج اب کم ہوتا جا رہا ہے)۔

ہم نے بطور مثال بعض سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے اور شہری زندگی کو زیادہ سامنے رکھا ہے۔ ان میں حسب علاقہ و موقع و ضرورت مزید سرگرمیوں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

عدل و انصاف

۱۔ ہر گاؤں، قصبے اور شہر کے وارڈ یا حصے میں ایک شرعی عدالت یا مصالحتی عدالت بنائی جائے جس میں مقامی عالم دین، ریٹائرڈ جج اور غیر جانبدار و انصاف پسند اشخاص شامل ہوں۔ اس طرح کی عدالتیں رفع نزاعات میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اس سے عوام کو سستا، فوری اور مطابق شریعت انصاف ملے گا اور عدالتوں پر بوجھ کم ہوگا۔

۲۔ پرائیویٹ سیکٹر میں ایسے کالج قائم کیے جائیں جن میں عصری قانون کے ساتھ اسلامی قانون اور

عربی زبان کے ٹھوس مطالعے، تدریس اور تربیت کا انتظام ہوتا کہ ایسے مفتی، وکیل اور جج معاشرے کو میسر آسکیں جو اسلامی اور عصری دونوں طرح کے قوانین کے ماہر ہوں اور شریعت کے مطابق فیصلے کر سکیں۔ یہ کالج موجودہ وکلاء، ججوں اور علماء کرام کی تربیت کا کام بھی کر سکتا ہے۔

امن وامان

محلے کی سطح پر جس کمیٹی کا ذکر ہوا، اسے مقامی امن وامان کی ذمہ داری بھی سونپی جاسکتی ہے اور یہ آسانی سے رضا کارانہ بنیادوں پر ہر گلی میں یہ انتظام کر سکتی ہے کہ ساری رات فوجان باری باری پہرہ دیں۔ اس سے چوری چکاری خود بخود بند ہو جائے گی۔ رفع نزاعات کا سادہ اور سریع نظام بھی، جو سطور بالا میں تجویز کیا گیا ہے، امن وامان کی حالت بہتر بنانے میں مدد و معاون ثابت ہوگا۔

صحت

ہمارے معاشرے میں شہروں میں ایلو پیتھ ڈاکٹر، طبیب اور ہومیو پیتھ کافی تعداد میں موجود تو ہیں لیکن عوام معاشی طور پر بد حال ہیں، انگریزی علاج اور ادویات مہنگی ہیں اور حکومت مغربی تہذیب کے زیر اثر ایلو پیتھ طریق علاج کی ہی زیادہ سرپرستی کرتی ہے۔ مذکورہ محلہ کمیٹی وسائل جمع کر کے محلے میں ہومیو پیتھک، طبی یا ایلو پیتھک سستی ڈسپنسری قائم کر سکتی ہے یا قرب و جوار کی کئی کمیٹیاں مل کر ایسا کر سکتی ہیں۔ اسی طرح گاؤں کے لوگ منظم ہو کر سستی ڈسپنسری کا انتظام کر سکتے ہیں۔

حاصلِ تعلیم

پاکستان میں جو بچے فرسٹ ڈویژن لیتے ہیں وہ عموماً ٹیکنیکل شعبوں میں جاتے ہیں اور ڈاکٹر انجینئر وغیرہ بنتے ہیں۔ جو بچے سیکنڈ ڈویژن لیتے ہیں وہ عموماً سی ایس ایس وغیرہ کر کے انتظامی شعبے میں چلے جاتے ہیں اور فرسٹ ڈویژن والوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ جو بچے تھرڈ ڈویژن لیتے ہیں وہ عموماً سیاست دان بن کر وزیر لگ جاتے ہیں اور فرسٹ اور سیکنڈ ڈویژن والوں (دونوں) کو کنٹرول کرتے ہیں۔ فیل ہونے والے عموماً انڈر ورلڈ مافیا میں چلے جاتے ہیں اور فرسٹ ڈویژن، سیکنڈ ڈویژن اور تھرڈ ڈویژن والوں (سب کو) کنٹرول کرتے ہیں۔

پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی

اسباب و عوامل

آج مسلم معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے اگرچہ اس کے ذمہ دار بنیادی طور پر ہم خود ہی ہیں کہ یہ ہمارا معاشرہ ہے اور اسے بگاڑنے یا سنوارنے والے کام ہم ہی کر رہے ہیں اور اگر معاشرے کا کوئی خاص حصہ یا طبقہ اس کے بگاڑ میں ملوث ہے تو وہ بھی ایک لحاظ سے پورے معاشرے ہی کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ایسا فاسد حصہ اس کا جزو ہے اور وہ اس کا علاج نہیں کر سکا۔ یوں معاشرے کے بگاڑ کی ذمہ داری، داخلی لحاظ سے، ہم مسلمانوں کی اور افراد معاشرہ ہی کی ہے لیکن بسا اوقات خارجی عوامل ان داخلی عوامل کو اس طرح کنٹرول اور ممہیز کرتے ہیں کہ وہ داخلی عوامل پر بھی غالب آجاتے ہیں یا بگاڑ میں ان کا حصہ داخلی عوامل سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ ایسے حالات میں اقبال کی طرح یہ کہنا صحیح نہیں ہوتا کہ ے

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تُو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

بلکہ صحیح موقف یہ ہے کہ ہمیں اپنوں سے بھی گلہ ہے کہ وہ یورپ و امریکہ کی غلامی پہ کیوں رضا مند ہو گئے ہیں اور یورپ و امریکہ سے بھی گلہ ہے کہ انہوں نے ہمیں غلام بنانے کے لیے سازشیں اور منصوبہ بندی کی اور اس کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ اختیار کیا اور ہر ظلم و جبر روا رکھا اور آج بھی وہ ہمیں غلام بنائے رکھنے کے لیے ترغیب و ترہیب کا ہر ہتھکنڈا استعمال کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ تو اتنے ظالم ہیں کہ مارتے ہیں اور رونے بھی نہیں دیتے چنانچہ انہوں نے اپنی طاقتور ابلاغی قوت اور پروپیگنڈا مشینری کے ذریعے اپنی سازشوں کے ذکر کو اس طرح ہلکا، سسطی اور مضحکہ خیز بنا کر پیش کیا ہے کہ اب آپ اس حوالے سے بات کریں، خواہ وہ کتنی ہی صحیح، مدلل اور باوزن ہو، تو اسے نظریہ سازش (Conspiracy Theory) کہہ کر حقارت سے رد کر دیا جائے گا گویا کہ علم و تحقیق کی دنیا

میں اس کا کوئی وزن ہی نہیں ہے۔ ہم استعمار کی اس سازش کو سمجھتے ہیں لہذا ہمارا رویہ یہ ہے کہ بلاشبہ ہم اپنی کمزوریوں، خامیوں اور اپنے بُرے کاموں کے خود ہی ذمہ دار ہیں اور ہمارے کچھ عناصر اگر اغیار کے ہاتھوں میں کھیلے ہیں اور میر جعفر و صادق کا کردار ادا کرتے ہیں یا شعوری و لاشعوری طور پر ان سے مرعوب و متاثر ہو کر اپنے رویوں کا تعین کرتے ہیں تو بلاشبہ یہ ہماری غلطی ہے، ہم بحیثیت ملت و معاشرہ اس کے ذمہ دار ہیں اور ہمیں ہی اس کا تدارک کرنا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ان دشمنوں کو نظر انداز کر دیں جو ہم سے یہ سب کرانے کے لیے سازشیں اور منصوبہ بندی کر رہے ہیں اور اپنی دشمنی کو دوستی کا لبادہ پہنا کر ہمارے پہلو میں خنجر گھونپ رہے ہیں اور مختلف الزام تراش کر حیلے بہانے ہمیں نیست و نابود کر رہے ہیں — آخر کیوں نہ ہم ان کی چالوں کو سمجھیں اور ان کا توڑ کریں؟

اس اصولی گفتگو اور اپنے منہج کے تعین کے بعد اب آئیے پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کے معاملے کی طرف۔ بلاشبہ یہ انتہا پسندی موجود ہے اور اس کے عوامل داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی۔ لیکن ہماری رائے میں خارجی عوامل اس وقت اتنے طاقتور ہیں کہ داخلی عوامل کو کنٹرول اور مہینز بھی وہی کر رہے ہیں۔ اس لیے پہلے ہم خارجی عوامل کا ذکر کریں گے اور ان کے بعد داخلی عوامل کی طرف آئیں گے۔

خارجی عوامل

خارجی عوامل میں سب سے بڑا عامل امریکہ و یورپ کی اسلام و مسلم دشمنی ہے۔ اہل مغرب ترغیب کے ہر پُر امن ذریعے سے اور اس میں ناکام ہونے پر اپنی عظیم جنگی قوت کے زور پر اسلام کا راستہ روکنا اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں بلکہ کر رہے ہیں اور جو مسلمان ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اپنی بھرپور بلاغی قوت اور میڈیا مشینری سے وہ اسے انتہا پسند اور دہشت گرد قرار دے دیتے ہیں۔ یہ موضوع چونکہ بہت وسیع الاطراف ہے اس لیے ہم نکات وار اس کی تفصیل بیان کریں گے:

مسلم انتہاپسندی اور دہشت گردی کا پروپیگنڈا

پاکستان میں مذہبی انتہاپسندی اصلاً تھوڑی ہے لیکن امریکہ و یورپ اسے قصداً، ایک حکمت عملی کے تحت اور اپنے مذموم مقاصد کی خاطر بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ گویا انتہاپسندی اتنی ہے نہیں جتنا اس کا پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا ایسا قصداً اور اپنے مذموم مقاصد کی برآری کے لیے کیا جا رہا ہے۔ ایک امریکی اگر اپنے ہم وطنوں کو مار دے تو مغربی میڈیا اسے عیسائی انتہاپسندی اور دہشت گردی نہیں کہتا۔ ہندوستان میں ہندو انتہاپسندی اور دہشت گردی زوروں پر ہے لیکن اسے اچھا لائیں جاتا۔ لیکن اگر کوئی مسلمان کچھ کر بیٹھے تو آسمان سر پر اٹھا لیا جاتا ہے کہ دیکھیے ہم نہ کہتے تھے کہ مسلمان ہوتے ہی انتہاپسند اور دہشت گرد ہیں بلکہ اگر وہ کچھ نہ بھی کریں تو ان پر دہشت گردی کی پلاننگ کا الزام لگا کر انہیں پکڑ لیا جاتا ہے اور ان کی دہشت گردی کا خوب پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ ایسے واقعات بھی سامنے آچکے ہیں کہ مغربی خفیہ ایجنسیاں اپنے مقامی ایجنٹوں کے ذریعے مسلمانوں کے ہمدرد بن کر انہیں فریب دیتی اور ورغلائی ہیں، پھر انہیں پھنسا لینے کے بعد مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کا زبردست پروپیگنڈا کرتی ہیں اور انہیں بطور ثبوت پیش کرتی ہیں۔

ایک امریکی پادری نے حال ہی میں علی الاعلان قرآن جلا کر پونے دو ارب مسلمانوں کے دل زخمی کر دیے ہیں۔ پیغمبر اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کی جاتی ہے اور ان کے کارٹون بنائے جاتے ہیں۔ مسلمان عورتوں کو حجاب پہننے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ مسجدوں کے مینار بنانے پر پابندی لگا دی جاتی ہے اور مزید یہ کہ مغرب میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے، مقامی لوگ ان کے ساتھ نفرت و حقارت کا سلوک کرتے ہیں، ان پر آواز کسے جاتے ہیں، مسجدوں میں سور کے سر پھینکے جاتے ہیں، تعلیم اور ملازمت میں ان کے ساتھ جانبداری برتی جاتی ہے لیکن یہ سب کچھ کرنے والوں کو انتہاپسند اور دہشت گرد نہیں کہا جاتا۔ ان پر عدم برداشت کا الزام نہیں لگتا۔

امریکہ نے ایک جھوٹے الزام پر عراق کو تباہ کر دیا، افغانستان کا تورابورا بنادیا، لاکھوں مسلمان قتل کر دیے گئے، لاکھوں گھر جلا دیے گئے، ہزاروں مسلمان عورتوں کی عصمت لوٹی گئی لیکن یہ انتہاپسندی ہے نہ دہشت گردی۔ اس کے برعکس مسلمان اگر کسی کو چھری بھی مار دے تو یہ دہشت گردی ہے۔ اگر

وہ اپنی سادہ لوحی میں ڈرون حملوں اور ڈیزی کٹر بمبوں کا مقابلہ کرنے کے لیے درے کی بنی ہوئی کلاشکوف لے کر کھڑا ہو جائے تو یہ بھی دہشت گردی ہے۔

مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کے اس جھوٹے پروپیگنڈے کے کئی مذموم مقاصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسلام اور مسلمانوں کو دنیا بھر میں بدنام کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ لوگوں کی توجہ ان (اہل مغرب) کی اپنی دہشت گردی سے ہٹا دی جائے۔ تیسرے یہ کہ مغرب میں اسلام جو تیزی سے پھیل رہا ہے اسے بریکیں لگائی جائیں۔ چوتھے یہ کہ دہشت گردی کے پروپیگنڈے کی آڑ میں (پاکستان جیسے) مسلمان ملکوں کی قیادت کو دباؤ میں رکھا جائے۔ پانچویں یہ کہ وہاں مداخلت کا بہانہ ہاتھ آجائے چنانچہ پاکستان میں اسی بہانے سے ڈرون حملے ہو رہے ہیں اور نظر پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر ہے — عراق اور افغانستان پر اسی بہانے چڑھائی کی گئی۔ چھٹے یہ کہ جن مظلوموں پر اہل مغرب حملہ آور ہوں انہیں دفاع کے جائز حق سے بھی محروم کر دیا جائے۔ ظاہر ہے دہشت گردوں کو مارنا تو ثواب کا کام ہے، وہ تو مجرم ہیں انہیں دفاع کا حق کیسے دیا جاسکتا ہے؟ تو خلاصہ یہ کہ مسلم معاشرے میں اتنی دہشت گردی اصلاً ہے نہیں جتنی بڑھا چڑھا کر پیش کی جاتی ہے اور جتنی ہے اس کے فروغ میں بھی بنیادی کردار امریکہ و یورپ ہی ادا کر رہا ہے، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی

پاکستان کے قبائلی علاقوں میں رہنے والے پٹھان بھائی یہاں صدیوں سے ہمارے ہمسائے ہیں۔ اہل پاکستان نے ان میں کبھی مذہبی انتہا پسندی کی رقت نہیں دیکھی۔ یہ لوگ سردیوں میں پینگ، پھٹکری اور کپڑا بیچنے پنجاب کے میدانی علاقوں میں آتے تھے اور گرمیوں میں واپس چلے جاتے تھے۔ روس نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے افغانستان پر حملہ کیا تو انہوں نے اپنے افغان بھائیوں کا ساتھ دیا جن کے ساتھ ان کے مذہبی، نسلی اور خاندانی روابط تھے بلکہ کہنا چاہیے کہ یہ علاقہ افغانستان ہی کی ایک پٹی یا توسیع (Extention) ہے اور یہ لوگ مذہب، نسل، رنگ، زبان، علاقہ اور کچھر ہر لحاظ سے ایک ہی گروہ ہیں۔ قبائلی علاقوں اور پاکستان نے جب افغانیوں کا ساتھ دیا تو امریکہ ان کا حمایتی تھا۔ اب جب امریکہ نے اپنے مفادات کے لیے افغانستان پر حملہ کیا تو بھی قبائلیوں نے

حسب روایت اپنے افغان بھائیوں کا ساتھ دیا۔ پاکستان کے غدار حکمران پرویز مشرف نے اپنے اقتدار اور ڈالروں کی خاطر ملک اور اس کے مفادات کا سودا امریکہ سے کر لیا لیکن قبائلی یہ نہ کر سکے نتیجتاً امریکہ ان کے خلاف ہو گیا اور ان پر حملے شروع کر دیے اور پاکستانی فوج سے بھی ان پر حملے شروع کر دیے۔ ظاہر ہے قبائلی کب تک صبر کرتے! بالآخر ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ اپنی بقاء کے لیے حملہ آور کفار اور ان کے حلیفوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑتے۔

پاکستان کی مغربی سرحد پر بسنے والے یہ قبائلی جن کے خلاف مذہبی انتہاپسندی اور ہشت گردی کا زبردست پروپیگنڈا یہودیوں کے زیر کنٹرول عظیم امریکی میڈیا مشینری کی سربراہی میں ساری دنیا میں جاری و ساری ہے (اس میں اہم کردار زر خرید پاکستانی میڈیا کا بھی ہے)۔ ان کے خلاف امریکہ و یورپ کی جنگی حکمت عملی اتنی وسیع الاطراف اور پیچیدہ ہے کہ بہت باریک بینی اور توجہ کے بغیر سمجھ نہیں آتی۔ یہاں ہم اس کے بعض اہم پہلوؤں کی تفہیم کی کوشش کریں گے۔

امریکہ نے اپنے یورپی حلیفوں کو ساتھ ملا کر جب افغانستان پر حملہ کیا (ویسے ان ممالک کے آپس میں لاکھ اختلافات ہوں لیکن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت و تعصب کی مشترکہ اساس رکھنے کی وجہ سے اہم یورپی ممالک، خصوصاً برطانیہ، فرانس اور جرمنی ہر اس معاملے میں امریکہ کی حمایت کرنے پر بخوشی آمادہ ہو جاتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہو) اور اس پر قبضہ کر لیا تو ان قبائل کو طالبان کی مدد سے روکنے اور پاکستان کے خلاف خفیہ اقدامات کرنے کے لیے اس نے پاکستان کے دشمن بھارت کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا جبکہ افغانستان تو اس کی جیب میں تھا ہی۔ ساتھ ہی اسرائیل اور روس کی عملی حمایت بھی اسے مل گئی جو پاکستان کے خلاف اپنا اپنا بغض اور دکھ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان ممالک کی خفیہ ایجنسیوں نے مل کر قبائلی علاقوں میں درانداز بھجوانے شروع کر دیے جنہوں نے پاکستانی فوج اور تنصیبات پر حملے شروع کر دیے۔ یہی درانداز مقامی مزاحمت کاروں کا حصہ بن گئے اور ان کی تنظیموں میں گھس گئے اور افغانوں اور ازبکوں کے لیے نسل، رنگ اور زبان کی ہم آہنگی کی وجہ سے یہ زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا۔ اس طریقے سے امریکہ نے مزاحمت کاروں کو اسلحہ اور ڈالر مہیا کرنے شروع کر دیے اور کچھ وار لارڈز کو بھی اس نے ڈالروں کی چمک سے خرید لیا۔

یوں امریکہ نے یہاں کثیر الجہت گیم شروع کر رکھی ہے۔ وہ خود بھی ڈرون حملوں سے قبائلیوں کو مار رہا ہے۔ پاکستانی فوج سے بھی انہیں مروا رہا ہے۔ وہ اپنے دراندازوں کے ذریعے مزاحمت کاروں کو پاکستانی فوج سے لڑا رہا ہے اور ان سے پاکستان میں خودکش حملے کرا رہا ہے اور بھارتیوں کو فائٹ اور بلوچستان میں گھس بیٹھنے کا موقع دے رہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے بلیک وائر اور ایسی ہی دوسری امریکی ایجنسیوں کے کرائے کے فوجیوں کو سی آئی اے کی وساطت سے سفارت کاروں کے بھیس میں پاکستان میں داخل کر رکھا ہے جو یہاں سبوتاژ کی کاروائیاں کرتے ہیں اور نام طالبان کا لگاتے ہیں۔ اس چوکھی جنگ سے وہ بیک وقت درج ذیل اہم مقاصد حاصل کر رہا ہے:

- ۱۔ پاکستان میں سیاسی اور معاشی عدم استحکام پیدا کرنا
- ۲۔ پاکستان اور قبائلیوں میں نفرت اور دوری پیدا کرنا
- ۳۔ پاکستانی فوج کو مختلف محاذوں پر اور قبائلی عوام سے لڑا کر کمزور کرنا اور پاکستانی عوام میں اسے غیر مقبول بنانا
- ۴۔ پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں تک رسائی اور ان پر قبضہ
- ۵۔ پاکستان کے دشمن بھارت کو پاکستان کے خلاف کھل کھیلنے کا موقع دینا خصوصاً بلوچستان کی اہم جغرافیائی پوزیشن کے پیش نظر اسے پاکستان سے الگ کرانا۔
- ۶۔ پاکستانی حکمرانوں اور عوام میں بُعد اور دوری پیدا کرنا

ان غایات کی آخری غایت یہ ہے کہ پاکستان جو اسلام کے نام پر بنا اور اب بھی اسلام کا علمبردار ہے، اس کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے، اسے ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے اور اس کی ایٹمی صلاحیت ختم کر دی جائے یا کم از کم اسے معاشی لحاظ سے مفلوج، سیاسی لحاظ سے کمزور، امریکہ کا غلام اور بھارت کا طفیلی بنا دیا جائے (اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے شر سے بچائے)۔ اس غرض سے امریکہ اور اس کے یورپی حلیفوں کا پاکستان میں اپنی مرضی کے حکمران لانے اور ان کی مرضی پر نہ چلنے والوں کو ہٹانے اور سزا دینے کا ایک طویل ریکارڈ ہے۔ بھٹو کی پھانسی، جنرل ضیاء الحق کے جہاز کا حادثہ، نواز شریف کی اقتدار سے محرومی اور جلاوطنی، پرویز مشرف کا لایا جانا اور ڈالروں کے لیے امریکہ کی غلامی اور غیر موثر ہونے

پر نکالا جانا: اور زرداری اور کیانی کی صورت میں تازہ دم تابعداروں کا لایا جانا۔۔۔ یہ سب اسی منصوبے کی کڑیاں ہیں۔

یہ تو تھی پاکستان کے حالات کی ایک تصویر۔ اگر اسے عالم اسلام کے تناظر میں دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ یہودیوں اور عیسائیوں کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف طویل جنگ کا ایک تسلسل ہے۔ مغربی تہذیب کی اٹھان ہی پندرہویں صدی میں مسلمانوں کے ہاتھوں رومی سلطنت کے آخری حصار اور قسطنطنیہ کے عیسائی ہیڈ کوارٹر کی فتح کے خلاف اہل مغرب کے انتقامی جذبے کا اظہار تھی جس کی ابتداء تحریک نشاۃ ثانیہ سے ہوئی۔ پھر جوں جوں مغرب ترقی کرتا گیا، مسلمانوں کی زندگی تنگ ہوتی گئی۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی کی شکست کے بعد خلافت کا خاتمہ، ترکی اور ایران میں مغربی تہذیب اور قوانین کا ریاستی طاقت سے نفاذ۔۔۔ یہاں تک کہ سارا عالم اسلام غلام بنالیا گیا، ان کے وسائل لوٹے گئے، ان کا ریاستی اور معاشرتی ڈھانچہ توڑ دیا گیا اور مغربی تہذیب کے اصولوں پر ان کی تعمیر نو کی گئی خصوصاً ذہن سازی اور تشکیل شخصیت کرنے والے تعلیم و تربیت کے اداروں کی تاکہ مسلمانوں کی آئندہ نسلیں استعمار کی وفادار اور غلام ذہن رکھنے والی ہوں۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا، مسلمان مقدور بھر مزاحمت بھی کرتے رہے اور بالآخر مشیت کا کوڑا حرکت میں آیا۔ کفار باہم دست و گریباں ہوئے اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اہل یورپ اس قابل ہی نہ رہے کہ مسلمان ممالک کو غلام رکھ سکیں چنانچہ مجبوراً انہیں آزادی دینا پڑی۔

لیکن چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے کی مثل کے مطابق استعمار مسلم ممالک کو براہ راست اور زبردستی غلام نہ رکھ سکا تو اس نے بھیس بدل لیا۔ اس نے نوزائیدہ مسلم ممالک میں اقتدار ان طبقوں کے سپرد کیا جو اس کے پروردہ تھے یعنی بیوروکریٹ، جاگیردار، سرمایہ دار اور ان کے تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل حضرات جو اس کی تہذیب سے مرعوب اور اس کے طرز زندگی کے شائق تھے۔ امریکہ و یورپ نے امداد اور قرضوں کے نام پر مسلمان ممالک کی معیشت تباہ کی۔ تعلیم اور میڈیا کو اپنے قابو میں کر کے نوجوانوں نسلوں کے قلوب و اذہان میں اباحت اور مادر پدر آزادی کا زہر پھیلایا، دینی قوتوں کو سیاست میں کامیاب نہ ہونے دیا اور انہیں سازشوں سے آپس میں

لڑایا۔۔۔ غرض انہوں نے پوری کوشش کی کہ مسلم معاشرے کمزور اور ناتواں رہیں اور اسلام سے وابستگی اختیار نہ کریں لیکن یہ پوری طرح ممکن نہ ہوا اور کچھ مسلمان ممالک سر اٹھانے کے قابل ہو گئے مثلاً پاکستان نے ایٹم بم بنالیا، افغانستان میں ٹھیٹھ اسلامی نظام آگیا، عراق نے قوت پکڑ لی اور ایران میں اسلامی انقلاب آیا تو اس صورت حال پر عالم کفر کے سردار امریکہ اور اس کے یورپی حلیفوں کی قوت برداشت ختم ہو گئی اور قدیم مغربی استعمار نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت، دشمنی اور تعصب کو منافقت، دُورِ رخے پن اور ڈپلومیسی کے جس نقاب میں چھپا رکھا تھا، اسے نبھانا اس کے لیے مشکل ہو گیا اور اس نے نائن الیون (۹/۱۱) کا ڈرامہ اسٹیج کیا تاکہ مسلم ممالک پر حملوں اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دیگر اقدامات کا جواز مہیا ہو جائے۔☆ اس نے پہلے عراق اور پھر افغانستان کو تاراج کیا اور ان پر قبضہ جمایا۔ آج کل پاکستان اور لیبیا کے خلاف جنگ جاری ہے اور ایران کے گرد گھیرائنگ کیا جا رہا ہے۔

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ کمیونزم کی شکست اور روسی ہلاک کے ٹوٹ جانے کے بعد امریکہ اور یورپ کو ایک عدد دشمن کی ضرورت تھی۔ وہ پریشان تھے کہ نیٹو جتنا بڑا ادارہ آخر کیا کرے گا اور اتنی بڑی جنگی مشینری اور مغرب کی حربی صنعت کو مصروف کیسے رکھا جائے گا؟ چنانچہ اگر کوئی دشمن نہیں تھا تو بھی ایک دشمن کی اختراع امریکہ و یورپ کی نفسیاتی اور حربی ضرورت تھی چنانچہ تہذیبی کشمکش (Clash of Civilizations) کی تھیوری زور شور سے پیش کی گئی اور اسلام اور مسلمانوں کی صورت میں ایک دشمن آخر کار تخلیق کر لیا گیا۔ چنانچہ اب وہ مسلمانوں سے لڑ رہے ہیں حالانکہ مسلمان ان کے کمزور حریف ہیں۔ وہ نہ ان سے لڑنا چاہتے ہیں اور نہ ان سے لڑنے کی سکت رکھتے ہیں۔

ان حالات میں جو مسلمان حکومتیں پوری طرح ان کے قابو نہیں آئیں ان کے خلاف پروپیگنڈا اور سازشیں اور جو مسلمان تنظیمیں ان کی مسلح مزاحمت کرتی ہیں ان کو مذہبی انتہا پسند اور دہشت گرد کہنا امریکہ اور اس کے یورپی حلیفوں کی پروپیگنڈا تکنیک ہے اور ان کے پاس اتنی بڑی میڈیا مشینری ہے کہ وہ سفید کو سیاہ اور سچ کو جھوٹ ثابت کر سکتی ہے۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ ان کی مزاحمت میں کوئی آواز

☆ خود یورپ و امریکہ میں بہت سے محققین، صحافیوں اور دانشوروں نے ثابت کیا ہے اور اس پر بہت سارے لٹریچر شائع کیا ہے اور انٹرنیٹ پر بھی کافی مواد موجود ہے کہ نائن الیون (۹/۱۱) کا واقعہ سی آئی اے اور موساد کی پلاننگ کا نتیجہ تھا۔

نہ اٹھے، کوئی کھڑا نہ ہو اور جو اس کی جرأت کرے اسے مذہبی انتہاپسند اور دہشت گرد قرار دے کر صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

ہم اگر اس بحث کو سمیٹیں تو کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں اس وقت جو دہشت گردی ہو رہی ہے، خود کش حملے ہو رہے ہیں اور پاکستانی فوج و بیوروکریسی کی تنصیبات اور مسجدوں، مزاروں، سکولوں اور بازاروں میں جو حملے ہو رہے ہیں ان کا سب سے بڑا سبب افغانستان میں امریکی مداخلت اور پاکستان کے خلاف امریکی عزائم اور سازشیں ہیں۔ قبائلی جو کچھ کر رہے ہیں وہ محض امریکہ اور اس کے حلیفوں کے ایکشن کے خلاف ری ایکشن ہے اور فطری اور منطقی بات ہے کہ بنیادی ذمہ داری عمل کرنے والے پر عائد ہوتی ہے نہ کہ رد عمل ظاہر کرنے والے پر۔ اور اس کا علاج بھی سادہ اور سہل ہے کہ جب عمل ختم ہوگا تو رد عمل بھی ختم ہو جائے گا۔ لہذا اگر پاکستان میں امن و سکون مطلوب ہے اور انتہاپسندی اور دہشت گردی کو ختم کرنا مطلوب ہے تو اس کا بنیادی حل یہ ہے کہ امریکہ افغانستان اور پاکستان میں اپنی جارحیت ختم کرے اور یہاں سے نکل جائے، ان شاء اللہ یہاں سکون ہو جائے گا، اور اگر یہاں بے چینی کے دیگر عوامل ہوں گے تو پاکستانی حکومت اور معاشرہ ان سے نمٹ لے گا۔

خلاصہ یہ کہ پاکستان میں انتہاپسندی اور دہشت گردی کا بنیادی سبب امریکہ اور اس کے حلیف ہیں اور جو لوگ اپنے دین اور وطن کی خاطر ان کی مزاحمت کر رہے ہیں اس کا حق انہیں شریعت اسلامی بھی دیتی ہے اور اقوام متحدہ کا چارٹر بھی، بلکہ دنیا کا ہر قانون آزادی، حق خود ارادیت اور بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے لہذا امریکہ اور اس کے حلیفوں کے خلاف مزاحمت کو مذہبی انتہاپسندی اور دہشت گردی نہیں کہا جاسکتا اور فرض کیجیے کہ یہ انتہاپسندی اور دہشت گردی ہے بھی تو اس کے ذمہ دار امریکہ اور اس کے حلیف ہیں اور اس انتہاپسندی و دہشت گردی کے خاتمے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ امریکہ افغانستان اور پاکستان سے نکل جائے یہ انتہاپسندی اور دہشت گردی خود بخود ختم ہو جائے گی اور اگر امریکہ یہاں سے نہ نکلا اور اس نے یہ جنگ پاکستان تک مزید پھیلا دی تو پاکستانی قوم بھی ان کے خلاف، ان شاء اللہ، ایسے ہی لڑے گی جیسے افغانی اور قبائلی لڑ رہے ہیں (خواہ ان کی حکومت اور فوج نہ بھی لڑے) اور یوں یہ انتہاپسندی اور دہشت گردی مزید بڑھے گی کم یا ختم نہیں ہوگی (جاری ہے)۔

دینی مدارس کے لیے لمحہ فکر یہ علماء کرام کی خدمت میں چند دردمندانہ گزارشات

دینی مدارس کے بارے میں بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ اسلام کے قلعے ہیں اور معاشرے میں جتنی دینی رونق نظر آتی ہے اس میں زیادہ تر کردار دینی مدارس ہی کا ہے۔ ہم بھی دینی مدارس کے حامی اور مددگار ہیں اور ان سے بہت سی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے دینی مدارس کے نظام کو مزید موثر اور خوب تر بنانے کے لیے بعض مشورے اور گزارشات ہم دینی مدارس کی بالغ نظر قیادت اور ان کے اصحاب فکر و نظر کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔

آج کی نشست میں ہم دینی مدارس کی قیادت کے سامنے دو امور استفسار کی صورت میں رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک داخلی حوالے سے کہ کیا آج کے دینی مدارس نمو ایمان اور اعلائے کلمۃ اللہ کے حوالے سے وہ فرد پیدا کر رہے ہیں جیسا فرد آنحضرت ﷺ نے تعلیم و تزکیہ سے پیدا کیا تھا؟ اور دوسرا استفسار خارجی حوالے سے کہ کیا ہمارے دینی مدارس آج کے سب سے بڑے عملی اور تہذیبی فتنے (یعنی مغربی فکر و تہذیب) کے رد کے لیے اسی طرح کوششیں کر رہے ہیں جیسی ہمارے اسلاف نے صدرِ اول میں یونانی فکر کے فتنے کے رد کے لیے کی تھیں؟

داخلی چیلنج

اعلائے کلمۃ اللہ (جسے آج کل کی اصطلاح میں غلبہ دین یا اسلامی نشاۃ ثانیہ بھی کہا جاسکتا ہے) کے حوالے سے سوچتے ہوئے پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام اسلامی معاشرے کو زوال پذیر ہونے سے کیوں نہ روک سکے؟ ظاہر ہے پہلے ہم اس سوال کا جواب دیں گے تو پھر ہی یہ طے کر سکیں گے کہ اعلائے کلمۃ اللہ یا اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے آج دینی مدارس کا کردار کیا ہونا چاہیے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اگرچہ ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جن کے نزدیک خود علماء کا فکری جمود اور مدارس کا ناقص نظام تعلیم و تربیت ہی مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب ہے اور وہی اسلامی نشاۃ ثانیہ کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بھی ہیں۔ تاہم اس انتہا پسندانہ نقطہ نظر کو اگر ہم تسلیم نہ بھی کریں اور یہ ذہن میں رکھیں کہ کوئی تہذیب اور معاشرہ جب زوال پذیر ہوتا ہے تو اس کے

سارے ادارے ہی دیمک زدہ ہو جاتے ہیں۔ لہذا کسی ایک ادارے یا عنصر کو اجتماعی زوال کا ذمہ دار قرار دینا قرین انصاف نہیں ہو سکتا۔ بایں ہمہ اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ کسی معاشرے کے عروج و زوال میں اہم ترین کردار اس کی سیاسی و مذہبی قیادت کا ہوتا ہے۔ سیاسی قیادت کے کردار کا اہم ترین ہونا ظاہر و باہر ہے، تاہم اس وقت وہ زیر بحث نہیں اور دینی قیادت کے حوالے سے ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ یہ قیادت اسلامی معاشرے کو زوال پذیر ہونے سے کیوں نہ بچا سکی؟ خصوصاً اس حوالے سے کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت شروع ہی سے علماء کرام کے ہاتھ میں رہا ہے۔

یہاں ایک بات کی ہم ابتداء ہی میں وضاحت کر دیں کہ اعلائے کلمۃ اللہ یا اسلامی نشاۃ ثانیہ کے الفاظ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم آج کل کے ماحول کے مطابق سیاسی جدوجہد کی بات کر رہے ہیں۔ نہیں، بلکہ ہم اس فرد کی تیاری کی بات کر رہے ہیں جو آنحضرت ﷺ کی تعلیم و تزکیہ کے نتیجے میں تیار ہوا تھا اور اسلام کے ہمہ جہتی غلبے کا بنیادی سبب بنا تھا۔

مسلمانوں کے زوال کے اسباب کی کنہ تلاش کرنے کا ایک منطقی اسلوب یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ صدرِ اوّل میں جب اسلام پھیلا اور اس زمانے کی غالب و طاقتور رومی و ایرانی تہذیبیں اس کے سامنے ڈھیر ہو گئیں اور مسلمانوں کو ہمہ جہتی عروج حاصل ہو گیا تو اس کے وسائل ذرائع کیا تھے؟ ان وسائل و ذرائع کا جب ہم تعین کر لیں گے تو ہمارے لیے اس نتیجے پر پہنچنا آسان ہو جائے گا کہ جب یہ وسائل و ذرائع کل اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلامی عروج کا سبب بنے تھے تو آج ان کا فقدان ہی سبب زوال و کسرت ہے کیونکہ چیزیں اپنے تضاد ہی سے پہچانی جاتی ہیں۔

صدرِ اوّل میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کے غلبے اور عروج کا سبب ہمارے نزدیک یہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ نے وحی ربانی کی رہنمائی میں مسلمانوں کی ایسی تعلیم و تربیت کی اور ”یعلّمہم الكتاب والحکمة ویزکیہم“ کے اصول پر ایسے افراد تیار کر دیے اور ان کے اندر ایمان کی ایسی سپرٹ اور طاقت بھر دی کہ حصولِ رضائے الہی اور آخرت میں اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارنا اور اس کے لیے مال، وقت، صلاحیتوں اور جان کی قربانی دینا ان کے لیے آسان ہو گیا۔ مسلمانوں کا فکری سانچہ اور ان کا نظام حیات یہ تھا کہ اصل کامیابی تو آخرت ہی کی کامیابی ہے تاہم دنیا میں بھی اگر ایک فرد اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارے تو اس کا حتمی نتیجہ طمینانِ قلب (الابد ذکر اللہ تطمئن القلوب) ہوگا اور اگر پورا معاشرہ (یا اس کی غالب و مؤثر تعداد) اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارے تو اس کا حتمی نتیجہ دنیا میں

عزت و سرفرازی اور غلبہ و عروج ہوگا (”وانتم الاعلون ان کنتم مومنین“۔)

یہاں اللہ تعالیٰ نے مسلم معاشرے کو غلبہ و عروج دینے کی جو گارٹی دی ہے اس کی کنہ پر اگر ہم غور کریں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے اور یہاں جو معاشرہ بھی اسباب دنیا مہیا کرنے میں دوسروں سے بڑھ جائے گا، وہ دوسروں پر غالب آجائے گا۔ اور دنیا میں اسباب پیدا کرنے کی صلاحیت حاصل کرنے میں جو اصول سب اقوام کے لیے مشترک ہے وہ یہ ہے کہ جس نظریہ حیات پر وہ یقین رکھتی ہے اس پر عمل کرنے میں اور اس کے لیے قربانی دینے میں وہ تہی یکسو اور کھنڈ ہے؟ کیونکہ یہی چیز اس کو وہ قوت محرکہ عطا کرتی ہے اور فرد کے اندر وہ صلاحیتیں ابھارتی ہے (جیسے محنت، پابندی قانون، نظم و ضبط، منصوبہ بندی، اطاعت، قیادت، اتحاد، شجاعت، ایثار و قربانی۔۔۔ وغیرہ) جو افراد معاشرہ کو اسباب دنیا مہیا کرنے کی طاقت عطا کرتی ہیں۔ اس توجیہ اور نقطہ نظر کی رو سے نبی کریم ﷺ کے تیار کیے ہوئے افراد کا ایمان اتنا قوی تھا اور اسلام کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کی کمٹنٹ ان کے اندر عملاً اتنی شدید تھی کہ ان کے اندر وہ صلاحیتیں ایک منطقی نتیجے کے طور پر اتنی اعلیٰ درجے کی پیدا ہو گئیں جن سے وہ اسباب دنیا مہیا کرنے پر، دوسروں سے بہتر طور پر، قادر ہو گئے اور یوں وہ دنیاوی طاقت میں دوسروں سے آگے نکل گئے اور غلبہ و عروج ان کا حق اور مقدر ٹھہرا۔

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے بداہتاً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صدرِ اوّل میں مسلمانوں کے غلبہ و عروج کا سبب وحی ربانی کے مطابق نبی کریم ﷺ کا وہ طریق تعلیم و تزکیہ تھا جس نے ایسے افراد تیار کیے کہ جن کی قوت ایمانی نے ان کی عملی صلاحیتوں کو اس طرح چلا بخشی کہ وہ اسباب دنیا مہیا کرنے پر دوسروں سے بہتر طور پر قادر ہو گئے — اس کے باوجود کہ ان کی آخری غایت حصول رضائے الہی اور اخروی کامیابی تھی، محض دنیاوی ترقی نہ تھی، اور یہ کہ مسلمان اس لیے زوال پذیر ہو گئے کہ ان کا ایمان کمزور ہو گیا جس کے نتیجے میں ان کے اندر انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارنے کا داعیہ مضبوط نہ رہا اور اس کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ ماند پڑتا گیا۔ اس وجہ سے ان کے اندر وہ صلاحیتیں پیدا ہونا بند ہو گئیں جو انہیں اسباب دنیا کے حصول پر قادر بناتیں — اور اس کی سب سے بڑی وجہ تھی نظام تعلیم و تزکیہ کا ناقص ہو جانا جس طرح کہ صدرِ اوّل میں ایمان اور جذبہ عمل کی مضبوطی کا بڑا سبب تھا نظام تعلیم و تزکیہ کا درست اور صحیح ہونا۔ اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تزکیہ ہمیشہ علماء کرام کے ہاتھوں میں رہا ہے۔

گویا ہم غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب (دوسرے کئی اسباب بھی ہیں جو اس وقت زیر بحث نہیں) ان کے نظام تعلیم و تزکیہ کا ناقص ہو جانا ہے جس کا سب سے بڑا مظہر اس کے پیدا کردہ افراد میں ایمان کی کمزوری اور اس کے نتیجے میں جذبہ عمل میں کمی اور اس کمی کے نتیجے میں اسباب دنیا کے حصول کی صلاحیتوں کا کم ہو جانا ہے جس کا نتیجہ دنیاوی زوال ہے۔

اب مدارس چلانے والے علماء کرام اور صلحاء عظام کے سوچنے کا مقام یہ ہے کہ وہ انتہائی تعقید، معروضیت اور غیر جذباتی انداز میں اس امر پر غور فرمائیں اور تحقیق و تجزیہ سے کام لے کر یہ معلوم کریں کہ دینی مدارس کا نظام تعلیم و تزکیہ ایسے افراد کیوں پیدا نہیں کر رہا جو عہد نبوی اور خلافت راشدہ کا نظام پیدا کرتا تھا؟ دین کا طالب علم ہونے کے ناطے ہم بھی اس ضمن میں کچھ عرض کر سکتے ہیں لیکن ہماری خواہش ہے کہ مدارس کے علماء کرام اس موضوع پر تدبر فرمائیں اور اپنے نتائج فکر سامنے لائیں تاکہ صحیح سمت میں عمل کی راہ کھل سکے۔

اس موضوع کو سمیٹتے ہوئے ہم عرض کریں گے کہ ہمیں ان لوگوں کی رائے میں زیادہ وزن محسوس نہیں ہوتا جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب یہ ہے کہ وہ سائنس و ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ گئے ہیں یا ان کے پاس دولت اور مادی وسائل کی کمی ہے۔ ہمیں اس موقف میں وزن اس لیے محسوس نہیں ہوتا کہ بحیثیت امت یہ ہمارے تجربے اور مشاہدے کے خلاف ہے۔ صدرِ اول میں مسلمانوں نے جب چند برسوں میں روم و ایران کی سلطنتوں کو الٹ دیا تھا تو وہ سائنس و ٹیکنالوجی میں ان سے آگے نہ تھے اور نہ ان کے پاس مادی وسائل اور دولت ان سے زیادہ تھی۔ اسی طرح یہ ملاحظہ فرمائیے کہ آج مسلمان ذلیل و خوار ہیں حالانکہ ان کے پاس ایٹم بم اور میزائل موجود ہیں اور ہر طرح کی دولت اور مادی وسائل کی بھی کمی نہیں۔ لہذا اصل اہمیت فرد اور اس کے ایمان اور جذبہ عمل کی ہے اور فرد کو بدلنا نظام تعلیم و تزکیہ کا کام ہے۔ یہ نظام ماضی میں علماء کرام کے ہاتھوں میں تھا اور آج بھی کسی حد تک ہے۔ اس لیے مدارس کے علماء کرام کے لیے یہ تدبر کا مقام ہے کہ وہ اس مسئلے پر غور فرمائیں اور کسی نتیجے پر پہنچ کر صحیح سمت میں عمل کی راہیں کشادہ فرمائیں۔

خارجی چینل

سطور بالا میں ہم نے جس اہم مسئلے کی طرف دینی مدارس کو توجہ دلائی، اس کا تعلق ان کے نظام تعلیم کے داخلی پہلو سے تھا، اب ہم اہل مدارس کی توجہ ایک ایسے معاملے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جس کی حیثیت ایک خارجی تحدی کی ہے اور اس کا انتہائی گہرا تعلق مدارس کے نظام تعلیم

و تزکیہ سے ہے — اور وہ ہے مغربی فکر و تہذیب۔ اہل علم جانتے ہیں کہ صدرِ اول میں جب مسلمانوں کا واسطہ یونانی فکر سے پڑا تو علمی لحاظ سے وہ ایک بڑا چیلنج تھا اور اس کے باوجود کہ اس وقت مسلم فکر و تہذیب اپنے جو بن پر تھی، اس کے گہرے اثرات مسلم علم و فکر اور مسلم نظام تعلیم و تزکیہ پر پڑے۔ بایں ہمہ امام اشعریؒ اور ماتریدیؒ نے متبادل فکر دے کر اور امام احمد بن حنبلؒ، امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ جیسے بزرگوں نے یونانی فکر اور اعتزال کا رد کر کے اس فتنے کو بڑی حد تک غیر مؤثر کر دیا۔

جو حیثیت ماضی میں یونانی فکر و تہذیب کو حاصل تھی آج وہی حیثیت مغربی فکر و تہذیب کو حاصل ہے اور بدتر صورت یہ ہے کہ آج ہم ہر لحاظ سے کمزور و ناتواں ہیں، زوال کے گڑھے میں گرے ہوئے ہیں اور دنیا کی اس طاقتور اور غالب فکر کو رد کرنا اور اس کا مقابلہ کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہے اور اس کے تہذیبی اثرات سے بچ نکلنا تو ہمارے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ اب اس فتنے کے مقابلے میں ہمارے علماء کرام کے رد عمل کا ذرا جائزہ لیجیے۔ انہوں نے اس تہذیب کے سیاسی اور عسکری حملے کو روکنے کی کوشش کی لیکن بوجہ ناکام رہے ☆۔ نتیجتاً اس سے نفرت کرنے لگے اور اس سے آنکھیں بند کر لیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے انگریزی زبان پڑھنے اور مغربی علوم سیکھنے کی بھی مخالفت کی اور جدید دنیاوی و مغربی علوم سے عدم اعتناء کا یہ رویہ آج بھی جاری ہے۔ لیکن ظاہر ہے آنکھیں بند کرنے سے فکری طوفان ٹلا نہیں کرتے چنانچہ مغربی فکر و تہذیب کی فتوحات جاری ہیں۔ اہل مغرب نے استعماری دور میں مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت کو اپنی مرضی کے مطابق بدل ڈالا اور مسلمانوں جیسا نام رکھنے والے اپنی فکر و تہذیب کے شیدائی پیدا کر لیے۔ مسلمان ملکوں کو (برائے نام) آزادی دیتے وقت اہل مغرب نے اپنے انہی شیدائی عناصر کو اقتدار بخشا اور مسلم معاشرے کو چلانے کا کام سونپا اور بعد میں بھی اپنی کوششوں اور سازشوں سے اس امر کو یقینی بنایا کہ انہی طبقوں کا اقتدار اور رسوخ مسلمان معاشرے میں قائم رہے۔ اس نظام کو ٹکست دینے کے لیے اہل دین نے جو سیاسی کوششیں کیں ان کو بھی مغربی طاقتوں نے اپنے مقامی گماشتوں کی مدد سے کسی نہ کسی طرح ناکام بنا دیا۔ اب علماء کرام بُرا نہ منائیں کہ بات اگر چرخ ہے لیکن سچی ہے کہ وہ چند مدارس میں قال اللہ و قال الرسول کی مسند کے

☆ کیوں ناکام ہوئے؟ یہ بھی سنجیدہ تدبر و تحقیق کا مقام ہے لیکن اگر ہم نے اس پر گفتگو شروع کر دی تو موضوع زیر بحث سے ہٹ جائیں گے لہذا فی الوقت اس سے صرف نظر کر کے آگے بڑھیے۔

جزیرے جمائے بیٹھے ہیں جب کہ ساری خشکی و تری میں مغربی فکر و تہذیب کا طوطی بول رہا ہے اور معاشرے کے سارے شعبوں میں اسی کا غلبہ ہے۔

اہل مغرب کے اتباع میں قائم کردہ تعلیمی نظام سے لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمان طلبہ ہر سال فارغ ہو کر نکل رہے ہیں جو معاشرے کو ہر سطح پر چلا رہے ہیں۔ نظام ان کے ہاتھ میں ہے، سیاست ان کے ہاتھ میں ہے، عدالتیں ان کی ہیں، کلچر ان کا ہے، میڈیا ان کا ہے۔۔۔ غرض سب کچھ ان کے پاس ہے۔ مغربی فکر و تہذیب کی تجویز کردہ بلکہ طے کردہ بے دینی کی راہ پر اس بگڑت دوڑنے والے معاشرے پر علماء کرام کی کوششیں اگر کچھ بریکوں کا کام کرتی تھیں تو وہ بریکیں بھی اب ناکام ہوتی نظر آرہی ہیں لیکن ہمارے دینی مدارس اب بھی اصرار کرتے ہیں کہ انہیں صرف مسجدوں کے لیے خطیب اور مدرسوں کے لیے علماء ہی تیار کرنے ہیں اور وہ ایسے فضلاء تیار کرتے ہیں جن میں سے کسی کو فارغ التحصیل ہونے کے بعد پتہ نہیں ہوتا کہ مغرب کی فکری بنیادیں کیا ہیں؟ اس کی تہذیبی اساس کیا ہے؟ اس کا فلسفہ کیا ہے؟ اس کے سماجی علوم کیا ہیں؟ اس کی سائنس اور ٹیکنالوجی کس فکر پر کھڑی ہے؟ سوال یہ ہے کہ جس فکر و تہذیب نے پچھلے تین سو سال سے آپ کے معاشرے کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے، آپ کی فکری اساس اور ملی وجود خطرے میں ڈال دیا ہے، آپ آج بھی اس کے مطالعے اور اس کی تفہیم کے لیے تیار نہیں ہیں؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب تک آپ اس فکر و تہذیب کو سمجھتے نہیں اس کا رد کیسے کریں گے؟ کیا یہ اسلام اور مسلم معاشرے کی ضرورت نہیں کہ مغربی فکر و تہذیب کا رد کیا جائے؟ اسلامی فکر و تہذیب پر مسلمانوں کا اعتماد و یقین بحال کیا جائے اور اس کا مغربی فکر و تہذیب سے برتر ہونا ہر مسلمان پر ثابت کیا جائے؟ اور کیا یہ آج کی ضرورت نہیں کہ مغربی فکر و تہذیب کے حوالے سے مسلمانوں کی راہنمائی کی جائے اور اس تہذیب سے تعامل کے نتیجے میں امت کو درپیش مسائل کا اسلامی تناظر میں حل پیش کیا جائے؟ اگر اس کی ضرورت ہے تو یہ سب کچھ کیسے کیا جاسکتا ہے جب تک مغربی فکر و تہذیب کا مطالعہ نہ کیا جائے، اسے سمجھا نہ جائے؟

آج ایک غزالی کی ضرورت ہے جو ”تہافت الفلاسفہ“ لکھے لیکن تہافت سے پہلے تو ’مقاصد الفلاسفہ‘ جاننے کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے دینی مدارس ابھی تک مقاصد الفلاسفہ جاننے پر تیار نہیں تو تہافت الفلاسفہ کی منزل کب آئے گی؟ اور لطف کی بات یہ ہے کہ قدیم یونانی فلسفہ آج بھی دینی مدارس میں (تھوڑا بہت) پڑھایا جاتا ہے لیکن جدید مغربی فلسفہ جو آج اسلام اور مسلمانوں کے لیے چیلنج بنا

ہوا ہے، اسے پڑھانے پر مدارس تیار نہیں ہیں۔ وہ افلاطون اور ارسطو کو تو جانتے ہیں لیکن کانٹ، ہیگل اور سارتر سے بے خبر ہیں۔

تو ہمارا دوسرا استفسار یہ ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے (بلکہ مسلم معاشرے کو تباہی و بربادی سے بچانے کے لیے) دینی مدارس کے علماء کرام غور فرمائیں کہ مغربی فکر و تہذیب کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کی راہ عمل کیا ہونی چاہیے؟ دین کا ایک طالب علم ہونے کے ناطے ہم بھی اس ضمن میں کچھ عرض کر سکتے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ علماء کرام اس موضوع پر غور فرمائیں۔ یہ ان کا مسئلہ ہے، انہیں اس پر سوچنا چاہیے اور کسی نتیجے پر پہنچ کر کوئی لائحہ عمل وضع کرنا چاہیے۔

ہم نے اس مضمون میں دو امور کی طرف دینی مدارس کے علماء کرام کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ ہماری رائے میں ان دونوں باتوں کا مسلمانوں کی تعلیم و تربیت سے بہت گہرا تعلق ہے اور دینی مدارس جب تک ان امور پر غور کر کے کوئی لائحہ عمل طے نہیں کرتے اور اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے، ہماری طالب علمانہ رائے میں، وہ اپنا کام مؤثر طریقے سے نہیں کر سکتے اور نہ مطلوبہ نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زیر اعانت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے خصوصی تعاون 10,000 روپے

نام..... پتہ.....

فون نمبر.....

چیک بنام ارقم فاؤنڈیشن اور منی آرڈر بنام ایڈیٹر، 136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوائیے۔

تعلیمی ثنویت کے نقصانات

بد قسمتی سے ہمارا نظام تعلیم ثنویت کا شکار ہو چکا ہے بلکہ علوم شرعیہ اور علوم عصریہ کے درمیان بُعد روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے اس بُعد اور ثنویت نے ہر دو علوم کو یکساں متاثر کیا ہے۔

ہمارے دینی مدارس اگرچہ ہر سال افراد تو پیدا کر رہے ہیں لیکن عصری علوم شامل نصاب نہ ہونے کے باعث وہ افراد (الاماء اللہ) نہ تو عصر حاضر کے سماجی و معاشرتی، معاشی و اقتصادی اور ملکی سیاسی مسائل سے کما حقہ آگاہ ہوتے ہیں اور نہ ہی قرآن و سنت کی ابدی تعلیمات کی روشنی میں ان مسائل کا قطعی اور مؤثر حل پیش کرنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ اس عجیب صورت حال نے فکرِ اسلامی کو ساقط و جامد کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف متشرقین مسلسل پوری قوت کے ساتھ اسلام کو عصر حاضر کے لیے ایک ناقابل عمل دین اور تہذیب رفتہ ثابت کرنے کی جسارت کر رہے ہیں دوسری طرف ہماری وہ نسلیں جنہوں نے باطل افکار و نظریات کے استیلاء کے دور میں آنکھیں کھولی ہیں باطل افکار سے مرعوبیت کے باعث عملاً اسلام سے مایوس ہوتی جا رہی ہیں۔

اسی طرح عصری علوم صدیوں سے ارتقاء پذیر رہنے کے باوجود عالم انسانیت کو درپیش مسائل کا ٹھوس اور قطعی حل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ علوم جسے مسئلہ کا حل قرار دیتے ہیں کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ حل بجائے خود ایک نیا اور لاینحل مسئلہ بن جاتا ہے۔ مسائل اور حل کی اس آنکھ پھولی کا منطقی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسائل رفتہ رفتہ پیچیدگیوں میں اس قدر الجھ گئے ہیں کہ ان کا سلجھنا محال نظر آتا ہے عصری علوم کا یہ تحریک و ارتقاء مسائل کا قطعی اور مؤثر حل اس لیے فراہم کرنے سے معذور رہا ہے کہ اس کا قبلہ ہی درست نہیں تھا۔

دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلباء کو گویا معاشرے میں عملی اور متحرک شہری کے طور پر قبول ہی نہیں کیا جاتا۔ اس صورتحال نے بھی ہمیں درج ذیل بڑے نقصان پہنچائے ہیں:

اولاً، دینی مدارس سے فارغ التحصیل حضرات کا عملی شعبہ ہائے زندگی سے انقطاع معاشرے میں ان کا وقار اور احترام مجروح کرنے کا باعث بنا ہے۔

ثانیاً، اس انقطاع کے باعث اسلام کی آفاقیت، ہمہ گیریت اور جامعیت کے تصورات متاثر ہوتے ہیں۔ ثالثاً، ہمارے معاشرتی ڈھانچے میں رفتہ رفتہ عیسائیت کی طرح دین اور دنیا کی تفریق کے مہلک

جراثیم پھیلتے جا رہے ہیں۔

راجاً، اس انقطاع کے باعث متمول گھرانے تو درکنار متوسط خاندان بھی اپنے ذہین بچوں کو دینی مدارس کے قریب نہیں جانے دیتے۔

خامساً، یہ انقطاع عملی شعبہ ہائے زندگی کے لیے بھی اس لحاظ سے ضرر رساں ہے کہ ان شعبوں کو علوم شریعت سے بہرہ ور رجال کارمیسر نہیں آتے جو اپنی دردمندی، اخلاص بصیرت اور ژرف نگاہی سے ان شعبوں کے احوال بدل سکیں۔

نظام تعلیم کے اس دہرے پن کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ نہ صرف دینی مدارس کے طلباء عملی شعبہ ہائے زندگی سے الگ تھلگ رہتے ہیں بلکہ وہ عصری تقاضوں کو کما حقہ نہ سمجھنے کے باعث اسلام کی خدمت بھی مؤثر انداز میں نہیں کر پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ خدمت دین کے لیے سرگرم اداروں کو وہ رجال کار خال ہی میسر آتے ہیں جو دعوت و تبلیغ اور تحقیق و تدریس کی ذمہ داریاں بطریق احسن سرانجام دے سکیں۔

اس نقطہ الرجال نے اسلامی تحریکوں کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ آج اگر اسلامی تحریکوں کی بھی کوئی مؤثر خدمت کرنی ہے تو ہمیں ایسے رجال کار بکثرت تیار کرنے ہوں گے جن کا ایک ہاتھ قرآن و سنت کے فیضان کی خیرات وصول کر رہا ہو تو دوسرا ہاتھ زمانے کی نبض پر ہو۔

اندریں حالات ایسے تعلیمی اداروں کا قیام ملک و ملت کی اولین ترجیح اور ناگزیر ضرورت ہے جہاں نہ صرف ہر دو علوم پڑھائے جائیں بلکہ استعماری سازشوں کے باعث علم میں پیدا ہو جانے والی اس مہلک شہوت کا قلع قمع بھی کیا جاسکے، اور معاشرے کو ایسے رجال کار میسر آسکیں جو عملی شعبہ ہائے زندگی کے احوال بھی سنوار سکیں اور اسلام کی خدمت کا فریضہ بھی بطریق احسن سرانجام دے سکیں۔

منتقلی دفاتر

تحریک اصلاح تعلیم کے دفاتر یکم اپریل 2011ء سے A-135 ہنزہ بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور سے A-71 فیصل ٹاؤن (عقب فیصل ہسپتال/دفتر پیپلز پارٹی) منتقل ہو گئے ہیں۔

فون 0300-460 9522، 042-3614 9359

بچے کی اسلامی تربیت میں سکول انتظامیہ کا کردار

سکول بچے کی تربیت پر بڑی حد تک اثر انداز ہو سکتا ہے اگرچہ گھر میں والدین، بہنوں بھائیوں اور خصوصاً والدہ کا رویہ بچے کی سیرت کی تعمیر اور کردار سازی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے اور خاندان، گلی، محلے اور معاشرے کا ماحول بھی بچوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض دیگر ادارے خصوصاً میڈیا (بشمول ٹی وی کارٹونز اور بچوں کے پروگرام) بھی بچوں کی ذہن سازی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سکول بھی بچے کی زندگی میں انتہائی اہم کردار ادا کرتا ہے اور اگر سکول چلانے والوں کو اپنی اس ذمہ داری کا احساس ہو تو وہ بچے کی صحیح اور اسلامی خطوط پر تربیت میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں بلکہ اگر وہ چاہیں تو اسکول سے باہر دیگر عوامل بچے کی غلط تربیت کرتے ہیں وہ ان پر بھی اثر انداز ہو کر بچے کی تربیت میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

سکول ایک ادارہ ہے جس کے مختلف حصے اور عناصر بچے کی تربیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان عناصر میں سکول انتظامیہ، استاد، نصاب اور سکول کا ماحول بشمول ہم نصابی و غیر نصابی سرگرمیاں شامل ہیں۔ اب ہم بچے کی تربیت کے حوالے سے اس میں سے ہر عنصر کے کردار پر روشنی ڈالیں گے۔

سکول انتظامیہ

یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ آج کل ہمارے ہاں سکولوں کا جو ماحول ہے اس میں بچوں کی تربیت پر سب سے زیادہ سکول انتظامیہ اثر انداز ہوتی ہے۔ روایتی طور پر نصاب اور استاد کا کردار اہم سمجھا جاتا ہے (اور ان کی اہمیت سے انکار کیا ہی نہیں جاسکتا) لیکن جب نصاب کے تعین اور استاد کے تقرر و تربیت کا انحصار اور سکول کے ماحول کا فیصلہ یہ سب سکول انتظامیہ کے پاس ہو تو ظاہر ہے اس کی اہمیت سب سے بڑھ جاتی ہے۔

پاکستان میں سکول پرائیویٹ سیکٹر میں بھی ہیں اور پبلک سیکٹر میں بھی۔ جب تک پرائیویٹ سیکٹر کو تعلیمی عمل میں شرکت کی اجازت نہ تھی، سرکاری سکول بہت اہمیت رکھتے تھے لیکن تعلیمی عمل میں پرائیویٹ سیکٹر کی شمولیت کے بعد سے پرائیویٹ سیکٹر کے سکول اہمیت اختیار کرتے گئے اور اب گورنمنٹ سکول بڑی حد تک صرف غریبوں کے بچوں کے لیے رہ گئے ہیں جو پرائیویٹ سکولوں کی

فیس ادا نہیں کر سکتے۔ ان پبلک سیکٹر سکولوں کا معیار تعلیم بھی دن بدن گرتا جا رہا ہے اور ان کے حالات قابل اصلاح ہیں اور حکومت کو ان سکولوں کے کردار کو مؤثر بنانے کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں کیونکہ تعلیم میں ریاست کے کردار سے پہلو تہی خطرناک نتائج کی حامل ہوتی ہے۔

لیکن پیشتر اس کے کہ ہم نصاب کے تعین، اساتذہ کے تقرر و تربیت اور سکول کے ماحول کے حوالے سے سکول انتظامیہ کے کردار پر روشنی ڈالیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنے معاشرے میں تعلیم اور سکول کے معروضی حالات پر بھی ایک نظر ڈال لیں تاکہ ہمیں اندازہ ہو جائے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو سکول انتظامیہ کے اذہان و قلوب، فکر و عمل اور ان کے رویوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

سکول انتظامیہ سے ہماری مراد پرنسپل یا ڈائریکٹر ہے۔ سکول اگر ایک فرد کا ہوا اور وہ چھوٹے پیمانے پر کام کر رہا ہو تو سکول پرنسپل اور مالک دونوں ایک ہی شخص ہوتا ہے لیکن پبلک سیکٹر کے علاوہ پرائیویٹ سیکٹر میں جب سے سکول سسٹمز وجود میں آ گئے ہیں یا بعض لوگوں نے تعلیم کو کاروبار بنا کر اس میں سرمایہ کاری شروع کر رکھی ہے تو سکول کی پالیسی انتظامیہ کے پاس ہوتی ہے اور پرنسپل ان کا ملازم اور ان کی پالیسی کو محض نافذ کرنے والا ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں ہماری مخاطب سکول انتظامیہ ہے، وہ جو بھی ہو۔ تو آئیے بات کا آغاز سکول انتظامیہ کے وژن، مشن اور مقصد تعلیم کے حوالے سے کرتے ہیں۔

۱۔ سکول کا وژن، مشن اور مقصد تعلیم

اس سے مراد ہے کہ پاکستان میں سکول چلانے والوں کے پیش نظر مقاصد تعلیم کیا ہیں؟ لیکن پاکستان میں چونکہ کئی طرح کے سکول پائے جاتے ہیں لہذا ان کی اقسام کا ذکر ناگزیر ہے۔ پاکستان میں بنیادی طور پر دو طرح کے سکول پائے جاتے ہیں، ایک سرکاری یعنی پبلک سیکٹر میں اور دوسرے پرائیویٹ سیکٹر میں۔ سکولوں کی ایک تقسیم اردو اور انگلش میڈیم کے حوالے سے بھی کی جاسکتی ہے اور طبقہ واریت کے لحاظ سے بھی۔ اس آخری تقسیم میں کچھ تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے:

- امیروں کے سکول (ایلیٹ کلاس کے لیے): یہ دو طرح کے ہیں ایک زیادہ امیروں کے لیے اور دوسرے متوسط امیروں کے لیے۔

- متوسط طبقے کے سکول: یہ تین طرح کے ہیں: اعلیٰ متوسط طبقے کے سکول، متوسط طبقے کے اور نچلے متوسط طبقے کے سکول۔

- غریبوں کے سکول: یہ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک ایسے غریبوں کے جو تھوڑی بہت فیس دے

سکتے ہیں اور دوسرے بہت ہی غریب بچوں کے لیے فری سکول جو بعض مخیر حضرات اور این جی اوز (NGOs) نے کھول رکھے ہیں۔

سکولوں کی ایک تقسیم دینی یا مذہبی حوالے سے بھی کی جاسکتی ہے۔ اس کی بھی کئی انواع ہیں مثلاً ایک نوع 'اقرأ روضۃ الاطفال' جیسے سکولوں کی ہے جو بنیادی طور پر جدید اور مقابلتاً بہتر ماحول میں حفظ قرآن کے ادارے ہیں لیکن ان میں سے بعض نے اب جنرل سکول کی طرح بھی کام کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ انگلش میڈیم سکولوں کی طرز پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض نے بد قسمتی سے مدارس والی مسلکی تقسیم جدید تعلیم میں بھی داخل کر دی ہے اور اس طرح کا ہر سکول ایک خاص مسلک کے بچوں کو پڑھا رہا ہے اور اب مسلک سے مناسبت رکھنے والا جدید نصاب بھی بننا شروع ہو گیا ہے اور بعض جگہوں پر بڑھایا بھی جا رہا ہے۔ اسلامی سکولوں میں بعض ایلٹیٹ کے لیے بھی ہیں اور ان میں اسے اکثر مکمل طور پر ویلنٹرائزڈ ہیں۔ متوسط طبقے کے سکولوں میں بھی بعض اسلامی ہیں اور بعض دینی جماعتوں کے متولین نے پوری چیز (chains) بھی کھولی ہوئی ہیں اور انفرادی سکول بھی ہیں جن میں سے اکثریت کے ماکان نے اسے ذریعہ روزگار بنایا ہوا ہے۔ اس طرح کے سکولوں میں نعرہ تو اسلام اور اسلامی تعلیم کا ہی ہے لیکن اس سے مطلوب متوسط طبقے کی اسلامیت کو اثر یکٹ کرنا نظر آتا ہے اور عملاً وہ کچھ خاص ڈیلیوریٹس کر رہے ہوتے، اور ان کا ماحول بھی عموماً سستی قسم کی مغربیت پر کاربند اداروں کا سانظر آتا ہے۔

پرائیویٹ سیکٹر میں مذکورہ بالا سکولوں کی غالب اکثریت کے منتظمین کے پیش نظر تعلیم ایک کاروبار ہے (الا ماشاء اللہ) جس میں ہر آدمی حسب حیثیت و مصلحت شریک ہے اور ان کی اکثریت کسی واضح اسلامی وژن اور مشن کے ادراک سے محروم ہے اور انہیں اسلامی حوالے سے تعلیم کے مقاصد اور غایت کا شعور ہی نہیں۔ اکثریت تو اسے روزگار اور کاروبار بنائے ہوئے ہے اور اس سے اوپر اٹھ کر سوچتی ہی نہیں۔ اور جو کوئی اس سے ہٹ کر سوچتا ہے وہ اتنا ہی سوچ پاتا ہے کہ طلبہ کے نمبر اچھے آجائیں، انہیں فارغ التحصیل ہونے کے بعد اچھی ملازمت مل جائے یا وہ کاروبار کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اس کے لیے انہیں پہننے بولنے کا سلیقہ آجائے، اچھی انگریزی آجائے (بلکہ وہ منہ بگاڑ کر امریکی یا انگریزی لہجے میں بولنے کے قابل ہو جائیں)، ان کی ابلاغی صلاحیت (کیونیکیشن سکلز) بہتر ہو جائیں، انہیں صاف ستھرا اور سوئڈ بوئڈ رہنا آجائے اور ہائی سوسائٹی میں موو کرنے کے آداب کے وہ خوگر ہو جائیں۔ اس طرح کی گرومنگ (بعض اسے تربیت بھی کہتے ہیں) ہی ان 'اچھے' اور 'بامقصد' تعلیمی اداروں کا مقصد ہوتی ہے اور ایسا کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ قوم اور معاشرے کی بہترین خدمت کر رہے ہیں اور ریاست

اور معاشرے کو ایسے افراد مہیا کر رہے ہیں جو 'قومی ترقی' میں اپنا کردار بخوبی ادا کر سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تعلیم میں یہ اپروچ خالصتاً سیکولر اور مغرب سے مرعوب اور غلامانہ ذہنیت کی عکاسی ہے اور عملاً نتیجہ ہے اس تعلیمی حکمت عملی کا جو انگریز نے ہندوستان پر قبضے کے بعد مسلم نظام تعلیم کو تباہ کرنے کے بعد محکموں کو نیا نظام تعلیم دیتے وقت اپنائی تھی اور جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ تعلیم ایسے لوگ پیدا کرتی رہے جو مغربی فکر و تہذیب، مغربی لائف اسٹائل اور مغربی ترقی کو زندگی کی معراج سمجھیں اور نام کے مسلمان رہیں۔ اس سے ان کے پیش نظر کئی فائدے تھے ایک تو یہ کہ مسلمان غلام ہی رہیں اور ان کو حکومت چلانے کے لیے وفادار کارکن (یعنی کلرک اور بیوروکریٹ) ملتے رہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں اپنی شناخت (identity) یاد نہ رہے یا بالفاظ دیگر وہ اچھے مسلمان نہ رہیں یا بننے کی خواہش مند نہ رہیں۔ انگریز نے برصغیر میں اس غرض سے اپنا تعلیمی نظام ترتیب دیا اور پھر اس کی کوششوں سے مسلمان خود بھی اس 'کار خیر' میں شریک ہو گئے جس کے نمائندہ فرد سید احمد خان تھے۔

اسلام میں مقصد تعلیم

یہاں تک پہنچنے کے بعد قاری کے ذہن میں لازماً یہ سوال پیدا ہوگا (یا ہونا چاہئے) کہ اگر یہ سب 'اسلامی' نہیں ہے تو پھر تعلیم کی اسلامی غایت کیا ہے؟ دیکھیے تعلیم میں اسلام کی بنیادی غایت یہ ہے کہ بچے کی فکر و نظر اسلامی ہو جائے، اس کے ذہن و قلب مسلمان ہو جائیں اور وہ عملاً مسلمان ہو جائے یعنی اسے پتہ چل جائے کہ اسلامی زندگی کیسی ہوتی ہے اور وہ کیسے گزارتے ہیں اور یہ تعلیم حاصل کرتے ہوئے اس کی ایسی تربیت ہو جائے کہ وہ عملاً ایسی زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے۔ یہ ہے اسلام کا مقصد تعلیم اور انہی معنوں میں اسلام میں تعلیم لازمی ہے کہ ہر مسلمان کو اپنے حقوق و فرائض اور حلال و حرام کا شعور ہونا چاہیے کہ اس کے بغیر اس کا مسلمان ہونا ہی بے معنی ہے۔

اس کے بعد وہ علوم و فنون ہیں جن کی معاشرے اور ریاست کے مختلف شعبوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی یقیناً مطلوب ہیں اور ان کا پورا کرنا بھی عین اسلامی تقاضا ہے۔ لہذا تعلیم کا یہ جزو بھی اہم ہے کہ اس کے بغیر مسلم معاشرے اور مسلم ریاست کی بقا ممکن نہیں۔ اس لیے مسلمان ماہرین تعلیم پہلی طرح کی تعلیم کو فرض عین اور دوسری کو فرض کفایہ قرار دیتے ہیں ☆۔ فرض عین سے مراد وہ تعلیم ہے جو ہر فرد مسلم کے لیے ضروری ہو جیسے ضروری دینی تعلیم اور فرض کفایہ سے مراد وہ تعلیم ہے جو ہر فرد کے لیے تو ضروری نہیں لیکن اتنے افراد کو ضرور حاصل کرنی چاہیے جس سے معاشرے اور ریاست کی

☆ دیکھیے امام غزالی کی احیاء العلوم کی پہلی جلد کا پہلا باب 'کتاب العلم'

ضرورت پوری ہو جائے جیسے میڈیسن اور انجینئرنگ کی تعلیم۔ یوں یہ دونوں قسم کی تعلیم شرعی طور پر ضروری ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر نظام تعلیم کا پہلا جز ختم ہو جائے تو نظام تعلیم غیر اسلامی ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس بھی صحیح ہے۔ ویسے بھی عقل عام کی بات ہے کہ کامیاب نظام تعلیم وہی ہوتا ہے جو معاشرے کو ایسے افراد تیار کر کے دے جو اس معاشرے کو مطلوب ہوں اور اس کا آئیڈیل ہوں کیونکہ اگر نظام تعلیم ایسے افراد مہیا نہیں کرتا تو معاشرے کی بقاء، تسلسل اور استحکام خطرے میں پڑ جائے گا۔ لہذا ضروری ہے کہ ایک مسلمان معاشرے کا نظام تعلیم ایسے افراد تیار کرے جو دنیوی مہارتوں کے ساتھ ساتھ فکری اور عملی طور پر مسلمان ہوں ورنہ وہ ناکام نظام تعلیم گردانا جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ مسلم معاشرے میں ہر سکول کا وژن اور مشن ایسے افراد کی تیاری ہونا چاہیے جو علمی اور عملی طور پر اچھے مسلمان ہوں اور وہ معاشرے اور ریاست کی ضروریات پوری کرنے پر قادر ہوں۔ اس کے لیے ضروری اور ناگزیر ہے کہ سکول کی تعلیم ایسی ہو جو طلبہ کے ذہن و قلب کو مسلمان بنائے اور ان کی تربیت ایسی ہو جو انہیں زندگی عملاً اسلامی احکام کے مطابق گزارنے کے قابل بنائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرے اور انہیں ایسے علوم و فنون میں طاق کرے جس سے وہ معاشرے اور ریاست کے مفید کارکن بن سکیں۔

یہ عقل عام (کامن سینس) کی بات ہے جسے ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ ہماری مندرجہ بالا گفتگو کا مطلب یہ نہیں کہ یہ سارے کام سکول کے کرنے کے ہیں اور کالج اور یونیورسٹی کا اس میں کوئی کردار نہیں بلکہ یہ بات خود بخود واضح ہے کہ یہ وژن، مشن اور مقصد تعلیم مسلم معاشرے کے ہر تعلیمی ادارے کا ہے خواہ وہ جس سطح کا بھی ہو۔ گو وہ تعلیم طلبہ کی عمر اور صلاحیتوں کے مطابق ہی دے گا۔ مطلب یہ کہ سکول اپنے طلبہ و طالبات کو جو تعلیم دے گا وہ سکول سطح ہی کی ہوگی لیکن وہ ایسی ہوگی جو ان مقاصد کو پورا کرنے والی ہو۔

خلاصہ یہ کہ پاکستان میں سکول انتظامیہ کے ہر فرد کے ذہن میں یا ہر اس شخص کے ذہن میں جو نیا سکول کھولنا چاہتا ہے یا اس وقت سکول چلا رہا ہے یہ واضح ہونا چاہیے کہ اس کے سکول کھولنے کا مقصد کیا ہے؟ یہ مقصد بنیادی طور پر یہ ہے کہ اس نے بچوں کو فکری اور عملی طور پر مسلمان بنانا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور انہیں ان فنون و علوم کی تعلیم دینا ہے جو پاکستانی معاشرے اور ریاست کی ضرورت ہیں۔ جو سکول ایسا نہیں کرتا وہ ایک ناکام سکول ہے۔ (جاری ہے)

ڈاکٹر محمد امین

تعلیم کی بربادی

تعلیم کی صوبوں کو منتقلی اور ایچ ای سی کی تحلیل

پاکستانی نظام تعلیم پہلے ہی تباہی کے راستے پر گامزن تھا کہ پاکستان کی نااہل اور کرپٹ مرکزی حکومت اسے مزید تباہ کرنے پر تئل گئی ہے۔ تعلیم کا انتظامی ڈھانچہ پہلے ہی صوبوں کے پاس تھا لیکن پالیسی سازی، نصاب سازی اور نگرانی کا کام مرکزی حکومت کے پاس تھا اور ظاہر ہے کہ اگر قومی یکجہتی مطلوب ہے تو یہ کام مرکز کے پاس ہی رہنے چاہئیں لیکن اٹھارویں آئینی ترمیم کے بعد جب مرکز کے کچھ شعبے صوبوں کو دینے کا فیصلہ ہوا تو بے عقلوں نے اس میں تعلیم کے مذکورہ شعبوں کو بھی شامل کر لیا۔ اس کے خلاف لوگوں نے آواز اٹھائی، ہم نے بھی ”البرہان“ میں لکھا لیکن مرکزی حکومت نے ضد دکھائی اور اس معقول بات پر کان دھرنے سے انکار کرتے ہوئے شعبہ تعلیم کو صوبوں کو دینے کا فیصلہ برقرار رکھا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اب ہائر ایجوکیشن کمیشن کو بھی تحلیل کر کے متعلقہ اختیارات صوبوں کو دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن ملک میں اعلیٰ تعلیم کی نصاب سازی، تدریس و تحقیق کی کوالٹی، اعلیٰ تعلیم کے فروغ اور نگرانی کا کام کرتا ہے۔ اگر اسے تحلیل کر دیا گیا اور ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم بھی صوبوں کو دے دی گئی تو یہ ملک کی یکجہتی سے کھیلنے اور صوبہ پرستی کو فروغ دینے کے حوالے سے بہت بڑا اقدام ہوگا۔ ہم اس کی بھرپور مخالفت اور مذمت کرتے ہیں۔

اس سے بدتر یہ کہ اہل دانش کی طرف سے کمیشن کو توڑنے کی مخالفت کے بعد عقل کے اندھوں نے (اخباری اطلاعات کے مطابق) یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایچ ای سی کو تو بہر حال توڑ دیا جائے اور اس کے اختیارات صوبوں کو دے دیے جائیں لیکن اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مرکزی ادارے کی ضرورت پر اہل دانش کے اصرار کے پیش نظر ایک نیا غیر موثر ادارہ بنا دیا جائے جو ایچ ای سی کی طرح خود مختار اور طاقتور نہ ہو بلکہ جس کی لگا میں بیوروکریسی اور سیاستدانوں کے ہاتھوں میں ہوں تاکہ ایچ ای سی سیاستدانوں کی جعلی ڈگریوں کا راز فاش کر کے جس طرح سیاسی مافیا کے لیے پریشانی کا سبب بنی تھی، نیا ادارہ اس طرح کی کوئی جرأت نہ کر سکے۔ پیپلز پارٹی کی مرکزی حکومت کی یہ منطق عذر گناہ بدتر از

گناہ کے مصداق ہے اور اس کی تعلیم، اخلاق اور میرٹ دشمن پالیسیوں کی مظہر اور زندہ ثبوت ہے جس پر اسے شرم آنی چاہیے۔

پاکستان اس وقت جن گونا گوں مسائل کا شکار ہے اور اس کے دشمن اسے ختم اور کمزور کرنے کے لیے جن بے شمار جہات میں کام کر رہے ہیں ان میں ایک اس کے نظام تعلیم کو تباہ کرنا بھی ہے۔ چنانچہ تعلیم اڈل تو ہے ہی برائے نام، نہ یہ کسی مرکزی اور صوبائی حکومت کی ترجیح ہے اور نہ اس کے لیے وافر فنڈز مہیا کیے جاتے ہیں۔ جو تھوڑی بہت ہے اسے بھی اس کی نظریاتی جہت سے ہٹانے اور اسے مغربی فلسفہ تعلیم کے مطابق ڈھالنے کے لیے امریکی اور یورپی دباؤ کو قبول کیا جا رہا ہے (اقوام متحدہ کا نام اور کام بھی اس ضمن میں استعمال ہو رہا ہے)۔ چنانچہ انگریزی ذریعہ تعلیم، غیر مسلم و غیر پاکستانی مصنفین کی مرتب کردہ نصابی کتب، غیر ملکی امتحانات (او اور اے لیول)، مخلوط تعلیم، اردو و عربی کی عدم اہمیت، غیر مؤثر اور برائے نام مذہبی تعلیم اور مغربی طرز زندگی کی حامل ہم نصابی و غیر نصابی سرگرمیاں (جیسے مغربی یونیفارم، مخلوط مینا بازار، ڈرامے اور کنسرٹ۔۔۔ وغیرہ) سب اسی لیے پاکستانی نظام تعلیم کا جزو بنائے گئے ہیں کہ یہاں مغرب کی غلامانہ ذہنیت رکھنے والی اور مغرب سے مرعوب نسلیں پروان چڑھائی جائیں جو اسلامی اقدار کو بھول کر مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کو اپنانے میں فخر و انبساط محسوس کریں۔

اسی غرض سے پاکستان میں پرائیویٹ سیکٹر کو تعلیم کے میدان میں کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے۔ یہاں سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے معیار، نصاب، اساتذہ کی اہلیت اور تنخواہوں، فیسوں اور ہم نصابی سرگرمیوں۔۔۔ پر کوئی چیک نہیں ہے۔ بھانت بھانت کے نصاب پڑھائے جا رہے ہیں، اساتذہ کی اہلیت کا کوئی معیار نہیں، من مانی فیسیں وصول کی جاتی ہیں اور اچھے مسلمان اور اچھے پاکستانی تیار کرنے کی باتیں ہوا میں اڑا دی گئی ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ ملک و ملت کے خلاف گہری سازش ہے کیونکہ یہ نظام تعلیم ہی ہوتا ہے جو معاشرے کے عقائد و اقدار کے مطابق افراد تیار کرتا ہے اور اگر یہ عمل رک جائے تو قومیں بانجھ ہو جاتی ہیں۔ پاکستان میں نظام تعلیم کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس امر کا مظہر ہے کہ قوم کی قیادت ایسے ہاتھوں میں ہے جن کو ملک کی سالمیت، بقاء اور اس کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت سے کوئی دلچسپی نہیں یا شاید وہ کسی ملک دشمن ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے شر سے محفوظ رکھے (آمین)۔

علماء دیوبند اور بریلی کے اتحاد کا ایک تاریخی معاہدہ

۱۲ فروری ۱۹۹۰ء کو خفیہ مسلک کے علماء دیوبند اور بریلی کا ایک نمائندہ اجلاس منعقد ہوا جس میں دونوں مکاتب فکر کے سرکردہ اور نمائندہ علماء اکٹھے ہوئے اور انہوں نے باہمی اتحاد و اخوت اور فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے متفقہ طور پر ایک فارمولا مرتب کیا جس کا متن درج ذیل ہے۔

”۔۔ کتاب ’اتحاد بین المسلمین‘ اور اس کے تقاضے، مسمیٰ بنام دعوتِ فکر مطبوعہ مکتبہ اشرفیہ مرید کے صفحہ ۳۴-۳۵ کی عبارت منقولہ از کتاب ’اشد العذاب‘ کے تحت دونوں فریقوں کے بزرگوں کا جن کے دستخط ثبت ہیں، اس بات پر اتفاق ہوا کہ مذکورہ بالا عقائد سے ہمیں پورا اتفاق ہے لہذا کسی بڑے سے بڑے عالم کی عبارت یا قول جو ان عقائد و افکار سے جو کتاب اشد العذاب کے صفحات کے حوالہ سے کتاب دعوتِ فکر کے صفحہ ۳۴-۳۵ پر چھپے ہوئے ہیں، متصادم یا متضاد ہوں ہم ان سے براۓ و لاتعلقی کا اعلان کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم دونوں مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے زیر دستخط حضرات اس بات کا معاہدہ کرتے ہیں کہ ہم باہمی اتفاق و اتحاد کا عظیم الشان اور پائیدار مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان میں پھر پاکستان سے باہر پوری دنیائے اسلام میں مکمل طور پر اسلامی نظام نافذ کریں گے اور پوری دنیائے اسلام میں پھر سے نظام خلافت کو قائم کر کے تمام عالم اسلام کو ایک امیر کے جھنڈے تلے جمع کریں گے نیز ہم اپنے اپنے فکری تشخص (بریلوی و دیوبندی) کو ختم کر کے صرف اہلسنت و جماعت کہلائیں گے۔ بحمدہ تعالیٰ اس کے بعد ہم میں کوئی اصولی و فروعی اختلاف نہیں رہا نیز ہم ایک دوسرے کو اور ایک دوسرے کے بزرگوں کو توہین آمیز اور غیر مؤدانہ الفاظ سے یاد نہیں کریں گے بلکہ ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہوئے ایک دوسرے کے خلاف کوئی رسالہ یا کتاب یا مضمون نہیں چھاپیں گے اور نہ ہی کوئی ایسا کام کریں گے جس سے باہمی اتحاد و اتفاق کو ٹھیس پہنچے اور یہ کہ اپنی تمام علمی و فکری صلاحیتیں اصلاح معاشرہ و اتحاد ملت کے لیے صرف کریں گے اور انفرادی و اجتماعی محافل و مجالس منعقد کر کے لوگوں کے ذہنوں کو اسلامی نظام کے لیے تیار کریں گے۔۔۔ فقط۔۔۔“

Settings\8822\My
Documents\shahzad\Journal\April
11\Journal pic.jpg not found.

اس معاہدے پر دستخط کرنے والوں میں مولانا مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی (ناظم جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور)، مولانا مفتی غلام سرور قادری (ناظم اعلیٰ جامعہ رضویہ ماڈل ٹاؤن، لاہور)، مولانا عبد الاحد القاسمی (مہتمم دارالعلوم، انڈیا) مولانا رشید میاں (لاہور) مولانا سلیم اللہ خان (مہتمم جامعہ فاروقیہ، کراچی)، مولانا فدا الرحمن درخواستی (مہتمم جامعہ انوار القرآن، کراچی)، مولانا عبدالمالک (جامعہ مرکز علوم اسلامیہ منصورہ، لاہور) اور مولانا عبداللطیف (ناظم مدرسہ عربیہ نجم المدارس، کراچی) وغیرہ شامل تھے۔

یہ معاہدہ اس بات کا ثبوت ہے کہ علماء کرام کے سنجیدہ عناصر اتحاد بین العلماء کے حامی اور موید ہیں اور اختلاف و انتشار کو ناپسند کرتے ہیں۔ لہذا جو عناصر علماء کے درمیان انتشار و تشتت کو ہوا دیتے ہیں وہ نہ علماء کے خیر خواہ ہیں اور نہ امت کے۔ علماء اور عوام کا مفاد اس میں ہے کہ ان کے اندر اتفاق و اتحاد کی فضاء پروان چڑھے اور ان کے درمیان اخوت و مودت اور بھائی چارے میں اضافہ ہو۔ اس وقت جب کہ عالم کفر خود ہمارے حکمرانوں کے تعاون سے اپنی طحڑانہ فکر و تہذیب، ترغیب و ترہیب کے ہر ہتھکنڈے سے ہمارے معاشرے میں نافذ کرنے پر ٹٹا بیٹھا ہے، سارے مکاتب فکر کے علماء کرام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ متحد ہو کر اس صورت حال کا مقابلہ کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مذکورہ معاہدے کی نہ صرف تجدید کی جائے بلکہ اس قسم کا معاہدہ علماء دیوبند و بریلی کے علاوہ جمیع مکاتب فکر کے درمیان ہونا چاہیے اور اس پر مؤثر انداز سے عمل درآمد کے لیے ہر مسلک کے علماء پر مشتمل ایک نگران کمیٹی بھی بنی چاہیے تاکہ اتحاد کے اس معاہدے پر مؤثر طریقے سے عمل درآمد کی ضمانت بھی حاصل ہو جائے۔

البرہان اب آن لائن بھی دستیاب ہے

البرہان کے شمارے اب آن لائن بھی دستیاب ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

www.safa.edu.pk

سراج محمود ناصر

0300-4609522

تزکیہ نفس، ترکِ رذائل

علامہ احمد جاوید

طولِ امل — نقصانات اور علاج

حکمِ ربّانی

”ذَرُّهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ“ (الحجر 15:3)
اے نبی! آپ ﷺ ان کو چھوڑ دیں کہ وہ کھائیں، پیئیں، عیش کریں اور خیالی امیدوں میں مگن رہیں۔
آئندہ انہیں اپنا انجام معلوم ہو جائے گا۔
”أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ ۚ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ“ (التكاثر 1-2)۔ لوگو! تمہیں بہت زیادہ حرص نے غافل کر دیا ہے یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچتے ہو۔

فرمانِ نبوی

”لا يزال قلب الكبير شاباً في اثنين في حب الدنيا وطول الأمل“ (صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب کراهۃ الحرص علی الدنيا)
بوڑھے آدمی کا دل دو چیزوں کے بارے میں ہمیشہ جوان رہتا ہے ایک دنیا کی محبت اور دوسرے لمبی تمناؤں۔

”عن عبد الله بن مسعود قال: خط النبي ﷺ خطاً مربعاً و خط خطاً في الوسط خارجاً منه، و خط خطاً صغراً الى هذا الذي في الوسط من جانبه الذي في الوسط، فقال: هذا انسان وهذا اجل محيط به، وهذا الذي هو خارج امله، وهذه الخطوط الصغار الاعراض، فان اخطاه هذا نهشه هذا، وان اخطاه هذا نهشه هذا“ (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب فی الال وطوله)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے زمین پر ایک مربع شکل بنائی۔ پھر اس کے وسط میں ایک خط کھینچا جو اس سے باہر نکل رہا تھا اور مربع کے وسط میں جو خط تھا اس سے باہر نکلتے ہوئے متعدد چھوٹے چھوٹے خط کھینچے اور فرمایا: یہ (مربع گویا) انسان (کا مسکن) ہے اور مربع کا بیرونی خط گویا موت ہے جو اس کو گھیرے ہوئے ہے اور جو خط باہر نکل رہا ہے وہ اس کی آرزوئیں اور تمنائیں ہیں اور یہ جو چھوٹے چھوٹے خط ہیں، یہ اس کے وہ تجاوزات ہیں جو وہ راہِ حق سے ہٹ کر کرتا ہے۔

س: طولِ اہل سے کیا مراد ہے؟

ج: طولِ اہل یعنی لمبی لمبی امیدیں باندھنا اور ایسی خواہشات رکھنا جن کی تکمیل کے لیے لمبا عرصہ درکار ہو۔

س: آپ کی تعریف سے یہ واضح نہیں ہوا کہ طولِ اہل دنیاوی معاملات میں ہوتا ہے یا دینی امور میں بھی اس کا دخل ہو سکتا ہے؟

ج: طولِ اہل دین میں بھی ہوتا ہے اور دنیا میں بھی۔ دین میں طولِ اہل کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص ساری دنیا میں اسلامی نفاذ اور غلبے کے خواب دیکھتا رہتا ہے لیکن خود اپنی ذات پر بالکل سامنے کے احکام کو بھی نافذ نہیں ہونے دیتا اور اسلام کے ان مطالبات پر تو اس کا دھیان نہیں رہتا جو گھٹے دو گھٹے میں ممکن العمل ہیں مگر منصوبے وہ لمبی مدت کے بناتا ہے جن کی کامیابی کے ضروری اسباب اسے میسر نہیں ہوتے۔ یہ شخص گویا دین سے کوئی سچی اور سنجیدہ وابستگی نہیں رکھتا بلکہ اپنے دینی نقائص کو خود اپنی نظر سے اوجھل رکھنے کے لیے ایسی بڑی بڑی باتیں سوچتا رہتا ہے جو اگر پوری ہو جائیں تو دین کے عظیم ترین فضائل حاصل ہو سکتے ہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں دینی معاملات میں طولِ اہل اپنی بے عملی پر پردہ ڈالنے یا اس کی خلش سے بچنے کی ایک کوشش ہے۔

دنیا میں طولِ اہل یہ ہے کہ ایک آدمی ترقی اور کامیابی کے ایسے منصوبوں میں خود کو منہمک کر لیتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لیے عمر نوح بھی کم ہو۔ یعنی اس پر دنیا کی محبت کا ایسا غلبہ ہو کہ وہ بالکل سامنے کی چیز یعنی انسانی زندگی کی محدودیت کو بھی فراموش کر دیتا ہو۔

یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ بیشتر خرابیوں کی طرح اس خرابی کے بھی بعض نقصانات دینی ہیں اور بعض نفسیاتی۔

س: تو کیا نفسیاتی ضرر دینی ضرر نہیں ہوتا؟

ج: اگر دینی ضرر کو قانونی معنی میں یعنی آخرت کے نقصان کے معنی میں بدل لیا جائے تو ضروری نہیں کہ ہر نفسیاتی ضرر دینی ضرر بھی ہو، کیونکہ نفسیات میں خلل پیدا کرنے والی کئی چیزیں شریعت میں عذر سمجھی جاتی ہیں اور عذر کا مضمر نہ ہونا واضح ہے مثلاً پاگل پن ایک نفسیاتی خرابی تو ہے مگر قانونی نقطہ نظر سے اسے دینی خرابی نہیں کہا جاسکتا۔

س: ذرا ٹھہر کر طولِ اہل کے دینی اور نفسیاتی نقصانات پر کچھ روشنی ڈال دیں؟

ج: طولِ اہل کے دینی نقصانات:

۱۔ طولِ اہل کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ بندے کے ذہن میں توکل، دعا، توفیق وغیرہ کا صحیح دینی تصور

یا تو باقی نہیں رہتا یا اتنا بگڑ جاتا ہے کہ اسے ان چیزوں سے ادنیٰ مناسبت بھی حاصل نہیں رہتی مثلاً کسی غبی آدمی کا یہ دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ اسے امام ابوحنیفہؒ بنادے یا کسی ناکارہ شخص کی یہ امید کہ وہ اللہ کی توفیق سے عمر بن عبدالعزیزؒ جیسا بن سکتا ہے یا کسی فاسق و فاجر کی یہ خوش فہمی کہ اللہ اسے جنت پیش کر دے گا۔ یہ سب طولِ اہل کی مثالیں ہیں جن سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک یا تو توکل کو مسخ کرتی ہے یا دعا اور توفیق کے تصور کو۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ توکل، دعا اور توفیق وغیرہ تعلق باللہ کے وہ لوازم ہیں جو بندگی کی عمارت میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر انہی میں خرابی پیدا ہو جائے تو بقیہ عمارت کو گرنے سے کیسے روکا جاسکتا ہے؟ اس چیز کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ عام طور سے طولِ اہل سے بندگی کی ایک جھوٹی فضا پیدا ہوتی ہے جو بظاہر حقیقی بندگی کی فضا سے کہیں زیادہ وسیع اور پُرکشش ہوتی ہے۔ اس میں مبتلا ہو کر بندہ بندگی کی حقیقی حدود سے اس طرح تجاوز کر جاتا ہے کہ اس کا فہم بھی بگڑ جاتا ہے اور ذوق بھی۔ ظاہر ہے کہ صحیح فہم اور صحیح ذوق سے محروم ہو کر دین سے تعلق کی کوئی شرط بھی پوری نہیں ہو سکتی۔

۲۔ اس سے ایک خاص طرح کا نفاق پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ آدمی کی نظر اپنی حقیقی شخصیت کی بجائے مفروضہ شخصیت پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ یہ نہیں دیکھتا کہ میں واقعتاً کیسا ہوں۔ بلکہ جو وہ ہونا چاہتا ہے اسے اپنی حقیقی شخصیت فرض کر لیتا ہے۔ یہ نفاق کی وہ قسم ہے جو کلیتاً قانونی نہ ہونے کے باوجود اپنے بعض مضمرات کی وجہ سے اصطلاحی نفاق سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ ایسا آدمی لاشعوری اور غیر ارادی طور پر ہی سہی مگر دین کی حقانیت کا زیادہ قائل نہیں رہتا اور اس کے باوجود خود کو دین کے اعلیٰ مراتب پر دیکھتا ہے یا دیکھنا چاہتا ہے۔

۳۔ بے عملی، یعنی طولِ اہل کی وجہ سے طبیعت میں روزمرہ کے ضروری دینی اعمال کی طرف سے بے رغبتی بلکہ تحقیر سی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ جو شخص خواب میں بادشاہ بنا بیٹھا ہو وہ بیداری میں مزدور بننا پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح جو لوگ بہت بڑے بڑے منصوبے بناتے رہتے ہیں وہ اپنی عملی صلاحیت اور اس کے استعمال کی طرف زیادہ مائل نہیں ہوتے۔ یہی بے رغبتی اور عدم میلان بڑھتے بڑھتے بے عملی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ویسے یہ بھی ملحوظ رہے کہ بے عملی طولِ اہل کا ایک بڑا محرک بھی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ طولِ اہل بے عملی سے پیدا ہوتا ہے اور بے عملی ہی پیدا کرتا ہے۔

۴۔ خود پسندی: طولِ اہل کے بنیادی محرکات میں بے عملی کے ساتھ خود پسندی سرفہرست ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ طولِ اہل میں گرفتار شخص خود پسند نہ ہو۔

۵۔ رجوع الی اللہ یعنی توبہ سے محرومی۔ طولِ اہل کے مارے ہوئے آدمی میں وہ آنکھ ہی اندھی ہو جاتی

ہے جو اپنے نقائص کا مشاہدہ کرواتی ہے اور بندے کو استغفار پر اکساتی ہے۔
۶۔ غور سے دیکھیں تو طولِ اہل ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مذاق ہے یعنی ادنیٰ استحقاق کے بغیر اللہ سے بڑے بڑے مطالبے کرنا اس سے مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟
طولِ اہل کے نفسیاتی نقصانات:

- ۱۔ بے عملی، دنیاوی پہلو سے
 - ۲۔ شعور اور ارادے کے فطری تعلق کا کمزور پڑ جانا۔ اس سے آدمی نارمل انسانوں کی فہرست میں شامل رہنے کے قابل نہیں رہتا۔
 - ۳۔ وہم اور التباس کا غلبہ
 - ۴۔ پست ہمتی اور فرار پسندی
 - ۵۔ خوش فہمی خصوصاً اپنے بارے میں
 - ۶۔ غیر متوازن داخلیت، جس سے آدمی کے اندر دوسری چیزوں سے تعلق کی استعداد کم ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہے۔
 - ۷۔ دوہری شخصیت یا شیذ و فرینا یعنی آدمی کی شخصیت کا دو حصوں میں بٹ جانا اور غیر حقیقی شخصیت کا حقیقی شخصیت پر غالب آ جانا۔
- طولِ اہل کے انہی نقصانات کی وجہ سے قرآن حکیم نے بھی اس کی مذمت کی ہے (الحجر ۱۵:۳) اور رسول کریم ﷺ نے بھی اسے فساد کی جڑ قرار دیا ہے (سنن بیہقی، شعب الایمان، دارالکتب العربیہ، بیروت ۱۹۹۰ء)۔

س: طولِ اہل کا علاج کیا ہے؟

ج: طولِ اہل اگر دنیاوی معاملات میں ہو تو اس کا بہترین علاج انفاق ہے۔ انفاق اگر اپنے مطلوبہ معیار کے ساتھ ہو تو یہ دنیاوی طولِ اہل کا فطری علاج ہے۔ انفاق کے بارے میں تفصیلی کلام تو ان شاء اللہ ہم آئندہ کریں گے، تاہم سر دست اس کا وہ پہلو واضح کر دینا ضروری ہے جسے ابھار کر طولِ اہل سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ پہلو جو ایک طرح سے انفاق کی روح ہے، یہ ہے کہ اپنی کوئی پسندیدہ یا ضروری چیز اللہ کی راہ میں دے دی جائے۔ اس کے بغیر انفاق اندر سے ناقص ہے اور اتنا موثر بہر حال نہیں رہتا کہ کسی باطنی خرابی کا ازالہ کر سکے۔ اپنی پسندیدہ چیزیں اللہ کی راہ میں دے دینا یا کسی دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر عملاً ترجیح دینا، آدمی کو پہلے ہی قدم پر دنیا اور اس عارضی زندگی کی محبت سے ایک درکار حد تک دور کر دیتا ہے۔ یہ دوری ہی دراصل طولِ اہل کا علاج ہے۔

دوسرا علاج، جو دراصل نفاق ہی کا ایک شعبہ ہے، یہ ہے کہ آدمی دولت اور جائیداد وغیرہ بنانے کی تگ و دو میں اتنا مشغول نہ ہو جائے کہ بعض شرعی مطالبات واضح طور پر مجروح ہونے لگیں۔ یہ شرعی مطالبات یاد رہے کہ صرف قانونی سطح تک محدود نہیں ہیں۔ اللہ اپنے بندوں کو حصول فرائض میں حریص دیکھنا چاہتا ہے۔ ہماری وہ مصروفیات جو اس حرص کو ختم یا کمزور کر دیں ہماری اس بندگی کو کامل نہیں ہونے دیتیں جس کا اللہ تعالیٰ ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ گویا اگر کوئی شخص اپنی ضروریات سے زائد اسباب کے لیے اتنا وقت اور محنت صرف کرتا ہے کہ اس کے اندر دین میں آگے بڑھنے کا تقاضا مدہم پڑنے لگے تو اس آدمی کو اس بارے میں سنجیدگی سے فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ دنیا جمع کرنے کی بیشتر صورتوں سے بچنے کی کوشش کریں۔ اس کوشش میں جتنی کامیابی ہوتی جائے گی اتنی ہی طول اہل سے رہائی کی صورتیں بھی نکلتی چلی جائیں گی۔

اصولی بات یہ ہے کہ جو بندہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دے گا اور اخروی زندگی کو دنیوی زندگی کے مقابلے میں زیادہ حقیقی سمجھے گا وہ طول اہل سے نکل جائے گا۔ یہ اصول کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

طول اہل کا ظہور دینی سرگرمیوں میں بھی ہوتا ہے۔ اس کے عموماً دو اسباب ہوتے ہیں: اپنے آپ کو ممتاز کرنے کی خواہش اور جذبات کا ذہن پر غالب آجانا۔ پہلا سبب ظاہر ہے کہ منافی اخلاص ہے اور اپنی جگہ طول اہل سے بھی ایک بڑی بُرائی ہے البتہ دوسری وجہ مخلص لوگوں کو پیش آتی ہے اور غلط ہونے کی صورت میں بھی لائق اجر ہے۔ تاہم علاج دونوں کا ضروری ہے۔ پہلی صورت میں علاج کا واحد راستہ اخلاص کی کمی کو دور کرنا ہے۔ اس کی تدبیروں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ دوسری صورت میں علاج کی دوسراہ سی ترکیبیں ہیں:

۱۔ اس بات پر یقین کہ بندہ نتائج پیدا کرنے کا مکلف نہیں ہے۔ ہوگا وہی جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کبھی خالی از مصلحت نہیں ہوتی۔ اس استحضار سے جذبات کی وہ شدت کم ہو جاتی ہے جو ذہن سے کام نہیں لینے دیتی۔

۲۔ زمینی حقائق یعنی اپنی صلاحیت اور باہر کی صورتحال کا صحیح اندازہ لگانا۔ اس سے ذہن میں وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے جو جذبات کو غالب آنے سے روک سکتی ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ طول اہل دنیاوی معاملات میں ایک ہولناک چیز ہے۔ دینی امور میں اس کی بنیاد سرے سے غلط بھی ہو تو بھی مثبت ہے، لہذا علاج کے لیے ترجیح اس کی پہلی قسم کو دینی چاہیے کیونکہ اس سے ایک ردیے کا ازالہ ہوگا۔ طول اہل کی دینی نوعیت کا معالجہ کسی بُرائی کے خاتمے کے لیے نہیں بلکہ ایک فضیلت یعنی فراست کے حصول کے لیے ہے۔

شیطان ہمیں کیسے ورغلاتا ہے؟

اسلام اور جدید نفسیات کی روشنی میں

قرآن حکیم کے مطابق شیطان بنی نوع انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ انسان کے خلاف شیطان کے حربے نہایت منظم ہوتے ہیں تاکہ وہ بنی آدم کو تباہ و برباد کر ڈالے۔ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے اتنی طاقت نہیں بخشی کہ وہ انسان کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اُس سے گناہ کروالے البتہ شیطان کو وسوسہ ڈالنے کی طاقت دی گئی ہے: ”مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ“ (الانسان ۱۴۴:۴)۔ جس انسان کا دل روحانی طور پر مضبوط ہوگا تو شیطان کا وسوسہ کمزور ہوگا لیکن اگر انسان کا دل بیمار ہوگا تو شیطان کی وسوسہ اندازی کامیاب اور کارگر ہوگی۔

شیطان، انسانوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہے کیونکہ اُس کے پاس ہزاروں سال کا جمع شدہ (collective) تجربہ موجود ہے۔ اس کے برعکس انسانوں کی اکثریت شیطان کی نفسیات اور اس کے حربوں کو نہیں سمجھتی۔ ابلیس کے متعلق ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس کے ہتھکنڈوں میں تخلیقی جدت (originality) نہیں ہوتی وہ بار بار اپنے قدیمی حربے انسان پر استعمال کرتا ہے اور انسان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اُسے اللہ کی نافرمانی پر ابھارتا ہے۔ مشہور نو مسلم سکالر مریم جمیلہ اپنی کتاب "The Generation Gap: Its Causes & Consequences" (مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۱ء) میں انسانی فطرت کے متعلق لکھتی ہیں: ”انسان کے رجحانات، اُس کی حیاتیاتی اور نفسیاتی ضروریات، اس کی جسمانی اور ذہنی قابلیتیں، اُس کے برائی کی طرف میلانات اور اُس کی اخلاقی اور روحانی اقدار کی ابدی تلاش جو اُسے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے، ان سب چیزوں میں انسان اوّل کے ظہور سے لے کر اب تک کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔“

ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان

حدیث رسول ﷺ میں آیا ہے: ”جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے۔“ (صحیح بخاری)

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ رمضان میں شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے سوائے ایک قسم کے شیطان کے اور وہ ہے قرین۔ یہ شیطان ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے اور چوبیس گھنٹے اور ہفتے کے ساتوں دن اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتا ہے۔ اس شیطان کا بزنس کبھی ماند نہیں پڑتا۔ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔ صرف اللہ کے نبی اس سے محفوظ ہوتے ہیں کیونکہ انبیاء و رسل کی زندگیوں میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لیے ہدایت رکھی ہے۔

ایک رات حضرت عائشہؓ کے ہاں قیام کے دوران رسول کریم ﷺ گھر سے باہر تشریف لے گئے۔ حضرت عائشہؓ کے دل میں خیال آیا کہ کہیں آپ ﷺ کسی دوسری بیوی کے پاس تشریف نہ لے گئے ہوں۔ جب آپ ﷺ واپس تشریف لائے اور عائشہؓ کو غصے میں پایا تو ان سے فرمایا: ”اے عائشہ! کیا تمہارا شیطان تم پر حاوی ہو گیا تھا؟“

حضرت عائشہؓ نے آپ ﷺ سے سوال کیا: ”یا رسول اللہ! کیا ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں“ حضرت عائشہؓ نے پوچھا: ”کیا آپ ﷺ کے ساتھ بھی ہے؟“ حضور ﷺ نے جواب دیا: ”ہاں! البتہ اللہ نے میری مدد فرمائی اور میں نے اُسے مسلمان کر لیا ہے۔“ (صحیح مسلم)

اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”آج کی شب ایک سرکش جن (شیطان) میری ایذا رسانی کے لیے چھوٹ نکلا تا کہ کسی طرح میری نماز قطع کرادے مگر اللہ نے مجھے اُس پر قدرت عطا فرمادی اور میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اُس کو مسجد کے کسی ستون کے ساتھ باندھ دوں تا کہ صبح تم سب اس کو دیکھ لو لیکن پھر مجھے اپنے بھائی سلیمانؑ کی دعا یاد آگئی ”پروردگار مجھے ایسی بادشاہت عنایت فرما جو میرے بعد کسی اور کو زیانہ ہو“ چنانچہ میں نے اُسے چھوڑ دیا۔“ (صحیح بخاری)

شیخ عبدالوہاب شعرائیؒ لکھتے ہیں کہ ”شیطان چونکہ یہ جانتا تھا کہ وہ آپ ﷺ کے قلب مبارک میں وسوسہ اندازی نہیں کر سکتا لہذا اُس نے کوشش کی کہ کسی طرح آپ کی نماز میں ہی دخل انداز ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ اس پر بھی قادر نہ ہو سکا اور ناکام واپس لوٹا۔“ (الیواقیت و الجواہر)

شیطان کی انسان کے خون میں گردش

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے متعلق ارشاد فرمایا ہے: ”إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ“ (یس 36:60) (بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے)۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ شیطان باغی تو اللہ کا ہے لیکن وہ اپنا دشمن انسان کو سمجھتا ہے۔ دراصل ابلیس اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ مزید برآں، وہ اپنے جنت سے نکلنے کا مورو الزام انسان کو ٹھہراتا ہے۔

ابلیس انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ شیطان کے لیے یہ طریقہ واردات آسان ہے کیونکہ وہ انسان کے جسم میں خون کی طرح گردش کر سکتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔“ (صحیح بخاری)

یہاں یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی جسم میں خون کی گردش کی دریافت کا سہرا برطانوی سائنس دان ولیم ہاروے (William Harvey) کے سر ہے جس نے اپنی کتاب *On the Motion of Heart and Blood in Animals* میں یہ دریافت بیان کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ولیم ہاروے سے صدیوں پہلے حدیث میں ہمیں بتا دیا تھا کہ شیطان بھی ہمارے جسم میں اسی طرح گردش کرتا ہے جس طرح خون گردش کرتا ہے!

انسان پر حملہ آور ہونے کے لیے شیطان کے تین دروازے

انسان کی شخصیت میں داخل ہونے کے لیے شیطان کو کسی کھلے دروازے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ آدمی کو اپنے جال میں پھنسا سکے۔ ایک مرتبہ شیطان اُس کھلے دروازے سے داخل ہو جائے تو پھر وہ بڑی مہارت کے ساتھ شخصیت انسانی کے قلعے کو مسمار کرنا شروع کرتا ہے۔ انسان پر حملہ آور ہونے کے لیے شیطان تین دروازے استعمال کرتا ہے:

۱۔ غصہ

غصہ ایک ایسا جذبہ ہے جو آدمی کو اپنے دفاع کے لیے ودیعت کیا گیا ہے لیکن اگر اس کو قابو میں نہ رکھا جائے تو انتہائی تباہ کن صفت ثابت ہوتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا: ”ان الغضب من الشيطان وان الشيطان خلق من النار وانما تطغى النار بالماء فاذا غضب

احد کم فلیتو صا (سنن ابی داؤد)۔

”غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے۔ آگ کو پانی سے بجھاتے ہیں پس جب تم میں سے کوئی غصے کی حالت میں ہو تو وہ وضو کر لے۔“

جب ہم آگ کی طبعی خصوصیات پر غور کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آگ اپنی فطرت میں بے ہنگم (Chaotic) ہوتی ہے اور بڑی آسانی سے کنٹرول سے باہر ہو جاتی ہے۔ جو بھی آگ کنٹرول سے باہر نکلے وہ تباہی پھیلا نا شروع کر دیتی ہے۔ آگ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اوپر کی طرف اٹھتی ہے جبکہ خاک کی یہ صفت ہے کہ وہ نیچے کی طرف کھینچتی ہے (اسی لیے انسان کی خوبی عاجزی اختیار کرنے میں ہے)۔ اس لیے جب کوئی شخص غصے میں آئے تو شیطان اُس کی انا (Ego) کو بھڑکا کر اس کے غصے کو ایندھن فراہم کرتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد رسول ﷺ ہے: ”تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جنہیں غصہ دیر سے آتا ہے اور جلدی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔۔۔ غصے سے ہوشیار رہو کہ یہ بنی آدم کے دل پر جلتے کوئلے کی مانند ہے۔“ (ترمذی)

شیطان انسانوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے غصے کے دروازے کو استعمال کرتا ہے۔ جب بندے کو غصہ چڑھ جائے تو پھر اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ماؤف ہو جاتی ہیں۔ شدید جذبات کی وجہ سے اس کے دماغ کے سوچنے کا حصہ عارضی طور پر ناکارہ ہو جاتا ہے اور غصے کی حالت میں وہ شخص نا سمجھی اور گناہ کے کام کر بیٹھتا ہے۔ امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی کے ماہر نفسیات ڈاکٹر ڈینیئل گولمین (Dr. Daniel Goleman) اپنی کتاب "Emotional Intelligence" میں لکھتے ہیں کہ چونکہ غصہ ایک انتہائی شدید جذباتی محرک ہوتا ہے اس لیے جب ایک شخص غصے کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کا دماغ جذباتی ہائی جیکنگ (Emotional Hijacking) کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر دماغ کے جذباتی حصے (Emotional Centers) انسانی دماغ کو اُچک کر لے جاتے ہیں اور دماغ کے غور اور تجزیہ کرنے کے حصوں (Analytical Centers of Brain) کو کام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس موقع پر دراصل دماغ کے جذباتی حصے بالخصوص Amygdala دماغ کے سوچنے سمجھنے والے حصوں کے مقابلے میں نہایت تیزی سے کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیطان غصے کی حالت میں انسان سے جلد بازی کے ساتھ کوئی حماقت کروا بیٹھتا ہے جس کا پچھتاوا ساری عمر

انسان کو رہتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے: ”العجلة من الشيطان“ (جلد بازی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے)۔

۲۔ خواہشات

انسان کا مادہ ترکیب دو چیزوں یعنی خاک اور روح پر مشتمل ہے۔ انسانی جسم کے اجزائے ترکیبی اسی دنیا سے مہیا ہوئے ہیں جبکہ اس کے جسم میں روح ایک فرشتہ اللہ کے اذن سے پھونکتا ہے۔ اس لیے انسانوں کے اندر بیک وقت دو طرح کی فطرتیں (Dualistic Nature) پائی جاتی ہیں۔ انسان کے حیوانی وجود یعنی جسم کی خواہشات وہی ہوتی ہیں جو دیگر حیوانوں کی ہوتی ہیں جبکہ انسانی روح کی خواہش آسمانی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے عبادت کی خواہش یا کسی ہستی کو اپنا پروردگار بنانے کی خواہش دراصل روح کی طلب ہوتی ہے جبکہ کھانا، پینا اور رہائش وغیرہ جسمانی خواہشات ہیں۔ مادی اشیاء کی محبت کا جذبہ انسان میں ایک نہایت قومی محرک ہے بالخصوص جبکہ مادی اشیاء محسوس کی جاسکتی ہوں۔ اسی لیے اہلئیں انسان پر حملہ آور ہونے کے لیے مادی خواہشات کا دروازہ استعمال کرتا ہے۔ دنیاوی و جسمانی خواہشات انسان کی عمر کے مختلف ادوار میں بدلتی رہتی ہیں اور شیطان اس چیز کا خاص طور پر خیال رکھتا ہے مثلاً شیطان یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ غیر شادی شدہ نوجوانوں کی دلچسپی کا سامان موسیقی، مخلوط محفلوں اور دوستوں یاروں کے ساتھ وقت ضائع کرنے میں رکھا ہوتا ہے۔ اس لیے نوجوانوں پر شیطان انہی چیزوں کا جھانسہ دے کر حملہ آور ہوتا ہے۔

لڑکیاں جب بلوغت کے دور میں پہنچتی ہیں تو جسم میں جنسی ہارمونز کی زیادتی کی وجہ سے وہ ڈیپریشن کا شکار ہو جاتی ہیں اس لیے ایسے دور میں شیطان انہیں کلاسیکی موسیقی میں سکون ملنے کی جھوٹی امید دلاتا ہے۔ اس کے برعکس لڑکے جب بلوغت کے دور میں قدم رکھتے ہیں تو ان کے جسم میں ٹیسٹو سٹیرون (Testosterone) ایک جنسی ہارمون کی ۲۵ گنا زیادتی کی وجہ سے ان کی طبیعت میں بے چینی اور سرکشی (Aggression) کی طرف میلان بڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے شیطان انہیں پاپ میوزک اور بُرے دوستوں کی محفلوں کی طرف آسانی سے مائل کر لیتا ہے۔

جب شادی کے بعد گھر بار بسا کر لوگوں کی طبیعتوں میں ذرا ٹھہراؤ آجائے تو شیطان لوگوں کی دوسری کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے جو معاشرے میں اپنا معیارِ زندگی (Standard of Living) بلند کرنے کی کبھی نہ ختم ہونے والی دوڑ ہے۔ جب مرد اور عورتیں اپنا معیارِ زندگی اونچے سے اونچا تر کرنے کی جدوجہد شروع کرتے ہیں تو پھر یہ دوڑ قبر پر جا کر منٹج ہوتی ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ”أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ ۚ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (التكاثر 1-2)۔“ تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ اسی فکر میں تم قبر تک پہنچ جاتے ہو۔“

۳۔ غفلت

انسان پر قابو پانے کے لیے جو تیسرا دروازہ شیطان استعمال کرتا ہے وہ سستی، کاہلی اور عمل کرنے میں تاخیر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی طبیعت کا میلان آرام طلبی کی طرف ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انسان بھلکرو واقع ہوا ہے۔ مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے عربی لفظ ”انسان“ کے متعلق فرمایا تھا: ”ان سمي الانسان انسانا لا نه عهد اليه فنسي“ ”انسان کو انسان اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے اللہ سے بندگی کا عہد کیا لیکن پھر وہ بھول گیا۔“ عربی زبان میں ”نسی ینسی“ سے مراد بھول جانا ہوتا ہے۔ اسی سے لفظ ”نسیان“ (بھولنے کی بیماری) نکلا ہے۔ پس انسان آسانی سے اپنی موت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اسی غفلت کی طرف قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ”اِفْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ“ (الانبیاء 1:21) ”قریب آگیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں۔“

قرآن کی زبان میں غفلت سے مراد انسان کا اپنی اخروی فلاح سے غافل ہو جانا ہے۔ لوگ عام طور پر موت کے متعلق سوچنا بھی پسند نہیں کرتے بالخصوص جوانی کی موت۔ لیڈی ڈیانا اور مدرٹریا کی وفات ایک ہی دن ہوئی لیکن لوگوں کو حیرانی مدرٹریا کی وفات پر نہیں تھی کیونکہ وہ بوڑھی ہو چکی تھی۔

عوام کے لیے تعجب کی بات لیڈی ڈیانا کی جوانی میں موت تھی حتیٰ کہ لوگ یہ کہتے ہوئے پائے گئے "She was too young to die" (وہ تو بہت جلدی مر گئی)۔ لوگ یہ بھول گئے کہ ملک الموت جب روح قبض کرنے کے لیے آتا ہے تو انسان سے اس کی عمر نہیں پوچھتا۔ امریکی ماہر نفسیات ڈاکٹر ارنسٹ بیکر نے اپنی پبلیٹز انعام یافتہ کتاب "The Denial of Death" (مطبوعہ نیو یارک ۱۹۹۷ء) میں بیان کیا ہے کہ اس دنیا میں تمام جانداروں میں انسان ایک ایسی مخلوق ہے جسے قدرت نے اتنی ذہنی صلاحیت بخشی ہے کہ وہ اپنے آخری انجام یعنی موت کے متعلق غور و فکر کر سکتا ہے۔ انسانی ذہن کی رسائی اس کائنات کی لامتناہی وسعتوں تک ہوتی ہے لیکن اس کا جسم ایسا ہے کہ بالآخر اس نے فنا ہونا ہے جسے قبر کے کیڑے کھاتے ہیں۔ انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں جاتے ہوئے ڈاکٹر بیکر بیان کرتے ہیں کہ انسانوں کی اکثریت سچائی کے سامنے ہوتے ہوئے بھی تمام عمر جھوٹ کے خول میں گزار دیتی ہے یعنی بچپن سے ہی اکثر لوگ اس احساس کو کہ ہم نے بالآخر مرنا ہے، ہر ممکن طریقے سے دباتے ہیں۔ دنیا کے تمام معاشروں میں ہیرو پرستی (Hero worship) کا تصور دراصل علامتی طور پر اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ ہم لافانی ہیں۔

شیطان انسان کو موت سے غافل کرتا ہے۔ اسے اس چیز پر ابھارتا ہے کہ وہ ٹی وی اور ڈش کے سامنے بیٹھ کر ریموٹ کنٹرول پر چینل بدلتا رہے حتیٰ کہ اس کی اپنی زندگی کا چینل موت کا فرشتہ آکر بدل دے۔ کمپیوٹر پر بیٹھ کر لائے گپ شپ (Chatting) کر کے اور عریانی دیکھ کر اپنی قبر کو گناہوں سے بھاری کرے۔ ریڈیو، ٹی وی اور یوٹیوب (You tube) پر گانے سنتا اور دیکھتا ہوا ایسا غافل ہو کہ نہ نماز کی پرواہ رہے اور نہ دنیا کی۔

ایسے ہی لوگوں کے متعلق حضرت علیؓ بن ابی طالب نے فرمایا تھا: ”الناس نیام فاذا ماتوا انتبهوا“ یعنی لوگ دنیا میں غفلت کی نیند سوتے رہتے ہیں اور جب وہ مریں تو (انہیں حقیقت کا ادراک ہوتا ہے اور) وہ جاگ اٹھتے ہیں۔“

تالیفات ڈاکٹر محمد امین

تعلیم و تربیت	صفحات	قیمت
۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل۔ چند نظریاتی مباحث (دوسرا ایڈیشن)	۵۴۰	۳۵۰ روپے
اسلامی تناظر میں تعلیمی نظام کی تشکیل نو۔ ماڈل اسلامی سکول، یونیورسٹی اور نظام تعلیم کا عملی خاکہ		
ثبوت کے خاتمے کا طریق کار، نفاذ اسلام اور مسلم نشاۃ ثانیہ میں تعلیم کا کردار، وغیرہ		
۲۔ ہمارا دینی نظام تعلیم ☆	۳۱۴	۳۵۰
دینی تعلیم کے چار وفاتوں کے ذمہ دار علماء سے طویل مشاورت		
اور مباحثے کے نتیجے میں دینی مدارس کے لیے اصلاحی تجاویز اور متبادل نصاب		
۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۵۳	۸۰
اس سوال کا جواب کہ جدید تعلیمی اداروں میں اسلامی نقطہ نظر سے		
بچے کی تربیت اور کردار سازی کیسے کی جاسکتی ہے؟		
۴۔ جدید اسلامی نصاب تعلیم ☆	۲۳۱	۲۶۰
پہلی سے بارہویں جماعت تک، سارے مضامین کے لیے،		
دینی اور عصری علوم کے امتزاج پر مبنی		
۵۔ پاکستان میں تعلیم کی اسلامائزیشن ☆	۴۲	۴۷
۶۔ مطالعہ قرآن وحدیث (برائے جماعت اول تا پنجم)	۲۴۰	۱۹۰
ہر جماعت کے لیے الگ۔ مروجہ دینیات سے الگ اور زائد مطالعہ کے لیے		
۷۔ بروشرز		
۱۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام	۱۲	
۲۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟	۱۶	
۳۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات	۱۲	۵۰
۴۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام	۱۲	
۵۔ والدین کے نام ایک اہم پیغام	زیر طبع	
۶۔ نوجوانوں کے نام ایک اہم پیغام	زیر طبع	

تربیت و تزکیہ

- ۱۔ اسلام اور تزکیہ نفس۔ مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ
تعمیر سیرت کا اسلامی منہج قرآن و سنت کی روشنی میں۔ مسلم ادارے اور
تجربات۔ مغربی فکر و عمل سے ان کا موازنہ۔ ایک علمی، فکری اور تحقیقی تجزیہ
- ۲۔ ترکِ رذائل
بُرائے اخلاق، ان کے اسباب، نقصانات اور ان سے بچنے کے عملی طریقے
- ۳۔ حقیقتِ تزکیہ نفس (سوالاً جواباً) ☆
مختصر، سادہ، عام فہم اور غیر اختلائی انداز میں اہم مسئلے کی وضاحت
- ۴۔ حقیقتِ تصوف
مختصر، سادہ، عام فہم اور غیر اختلائی انداز میں اہم مسئلے کی وضاحت

قرآن و سنت

- ۱۔ سورہ یٰسین
دورنگوں میں، بیک وقت تین تراجم (لفظی، با محاورہ اور تفسیری)
مع قرآنی عربی الفاظ کے اردو استعمالات کی نشاندہی کے
- ۲۔ Riyadh-us-Saliheen (2 Vols)
حدیث اور تزکیہ نفس کی معروف کتاب ریاض الصالحین
اور اس کے حواشی کا انگریزی ترجمہ
- ۳۔ Noble Quran, Part 1 ☆
قرآن حکیم کے پہلے پارے کا انگریزی میں لفظی و لغوی ترجمہ
- ۴۔ Noble Quran, Part 2-9 ☆
پارہ ۲ تا ۹ کا انگریزی میں لفظی و لغوی ترجمہ
- فقہ و قانون
۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون ☆
۲۔ Islamization of Laws in Pakistan
پاکستان میں مروجہ قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کی
جدوجہد کا علمی تجزیہ، ضیاء الحق دور کا خصوصی مطالعہ
- ۳۔ السلطۃ التشريعیۃ۔ دراسة مقارنة (عربی) ☆
اسلام میں اجتہاد اور مغرب میں قانون سازی کے عمل کا تقابلی مطالعہ

مسلم امہ

- ۱۔ مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل ۲۵۰ ۴۰۷
- اس اہم سوال کا جواب کہ مسلمان کس طرح زوال کے موجودہ گرداب سے نکل سکتے ہیں اور کس طرح دوبارہ غلبہ و عروج سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ مکمل لائحہ عمل
- ۲۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش۔ ایک تجزیہ، ایک مطالعہ (دوسرا ایڈیشن) زیر طبع
- ۳۔ جہاد اور دہشت گردی۔ عصری تطبیقات ۱۰۰ ۱۳۰
- ۴۔ مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ ۸ ۱۲

سیاسیات اسلام

- ۱۔ اسلام اور پاکستان ☆ ۱۵۵ ۱۲۷
- پاکستان میں نفاذ اسلام کا صحیح طریق کار
- ۲۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی ☆ ۱۴۰ ۱۳۳
- ۳۔ سیاسی جماعتوں کی شرعی حیثیت ☆ ۵۰ ۲۵
- ۴۔ اسلام اور جدید سیاسی مسائل زیر طبع

اسلام (متفرق)

- ۱۔ رزم حق و باطل ☆
- ان مسلم داعیوں اور حریت پسندوں کا تذکرہ جنہیں کج فہم مسلم حکمرانوں سے کشمکش کرنا پڑی
- ۲۔ مقالات ایمین (دو جلدیں) ☆ ۱۳۰ ۱۱۸
- ۱۳۵۰ ۱۲۵۸

ان مضامین و مقالات کا مجموعہ جو مختلف اوقات میں جرائد و اخبارات میں چھپتے رہے

- ۳۔ عصر حاضر میں تعمیر دین
- ۴۔ ایک نئی دینی تحریک کی ضرورت
- ☆ نوٹو کا پی مہیا کی جاسکتی ہے۔

- خرید کتب کے لیے تحریک اصلاح تعلیم کے دفتر سے رابطہ کیجیے، فون نمبر 0300-4609522

- مندرجہ بالا قیمتوں میں ڈسکاؤنٹ شامل ہے ڈاک خرچ شامل نہیں جو موجودہ قیمت کا ۱۵% ہوگا۔

طریق ادائی: منی آرڈر یا پے آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ، A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور۔